اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البُرہان

لاہور

نومبر ۲۰۲۴ء

مُدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan November 2024

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب		صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)		
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل		۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال		۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار		۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب - خدشات و مضمرات		۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین		۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ و طالبات		۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)		۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت		۱۲۰
۹	اسلامی علوم میں تحقیق		۲۷۲
	طلبہ کی اسلامی تربیت		
۱۰	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	ای بُک	۱۷۲
۱۱	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت - ہینڈ بک و گائیڈ		۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس		
۱۲	ہمارا دینی نظام تعلیم		۲۵۰
۱۳	نصابِ مدنیؒ		۴۰
۱۴	مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ و تجزیہ	ای بُک	۱۵۶
۱۵	اصلاحِ دینی مدارس		۳۵۲
	اسلامی تحریکیں		
۱۶	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟		۲۴۰
۱۷	خاموش انقلاب ناگزیر ہے		۲۸۸
۱۸	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور		۸۴
۱۹	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت		۷۲
	تزکیۂ نفس		
۲۰	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)		۹۰۳

نمبر شمار	کتاب		صفحات
۲۱	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	ای بُک	۶۲
۲۲	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	ای بُک	۵۶
۲۳	ترکِ رذائل (احمد جاوید)		۲۹۲
۲۴	عصر حاضر میں اسلام اور تعمیر سیرت		۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر و تہذیب		
۲۵	اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش		۱۷۶
۲۶	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	ای بُک	۱۷۶
۲۷	اسلام اور ردِ فکرِ مغرب		۲۱۶
	تفہیم دین		
۲۸	عروجِ اُمتِ مسلمہ (مسلم نشأۃ ثانیہ)		۳۸۴
۲۹	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت		۴۸
۳۰	رزم حق و باطل	ای بُک	۸۰
۳۱	اسلام اور پاکستان	ای بُک	۳۰۰
۳۲	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	ای بُک	۲۵۰
۳۳	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	ای بُک	۶۷۶
۳۴	مقالاتِ امین (جلد دوم)	ای بُک	۶۴۲
۳۵	جہاد اور دہشت گردی - عصری تطبیقات	ای بُک	۱۳۰
	اللغة العربية		
۳۶	السلطة التشريعية_دراسة مقارنة	ای بُک	۱۵۰
	English Books		
۳۷	Islamization of Laws in Pakistan		250
۳۸	Riyaz us Saliheen I & II		950
۳۹	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10		500

مکتبہ البرہان
136-نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
0336-1913636

ISBN 969-8773-25-8

تدریس القرآن

سبق: ⑨ — قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے — (آیت: ۳۴-۳۹)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ — اٰیاتھا ۲۸۶ — رکوعاتھا ۴۰

وَاِذْ	قُلْنَا	لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اسْجُدُوْا	لِاٰدَمَ	فَسَجَدُوْٓا	قُلْنَا	قول واقرار، اقوال
اور جب	کہا ہم نے	فرشتوں سے	تم سجدہ کرو	آدم کو	تو انہوں نے سجدہ کیا	اسْجُدُوْا	سجدہ، سجود، مسجود، ساجد
اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم سب آدم کے آگے جھکو تو سب جھک گئے							

اِلَّآ	اِبْلِيْسَ ؕ	اَبٰى	وَاسْتَكْبَرَ ۟	وَكَانَ	مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾	اسْتَكْبَرَ	تکبر، کبر، متکبر
سوائے	ابلیس کے	اس نے انکار کیا	اور اس نے تکبر کیا	اور ہو گیا	انکار کرنے والوں میں سے	الْكٰفِرِيْنَ	کفر، کفار، تکفیر، کافر
سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا، تکبر کیا اور وہ (حق کا) انکار کرنے والوں							

وَقُلْنَا	يٰٓاٰدَمُ	اسْكُنْ	اَنْتَ	وَزَوْجُكَ	الْجَنَّةَ	اسْكُنْ	سکونت، مسکن، ساکن
اور ہم نے کہا	اے آدم	رہو	تم	اور تمہاری بیوی	جنت میں	زَوْجُكَ	زوجہ، متزوج، ازدواجی زندگی
میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی رہو							

وَ	كُلَا	مِنْهَا	رَغَدًا	حَيْثُ	شِئْتُمَا ۪	وَ	لَا	كُلَا	اکل وشرب، ماکولات
اور	تم دونوں کھاؤ	اس سے	خوب	جہاں سے	چاہو تم دونوں	مگر	نہ	شِئْتُمَا	ان شاء اللہ، ماشاء اللہ
جنت میں اور جہاں سے چاہو خوب کھاؤ (پیو)									

تَقْرَبَا	هٰذِهِ	الشَّجَرَةَ	فَتَكُوْنَا	مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾	تَقْرَبَا	قریب، قربی، قرب، قربت
تم دونوں قریب جانا	اس	درخت کے	ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے	ظالموں میں سے	الشَّجَرَةَ	شجر کاری، شجر وحجر
مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا					الظّٰلِمِيْنَ	ظلم، ظالم، مظالم

فَاَزَلَّهُمَا	الشَّيْطٰنُ	عَنْهَا	فَاَخْرَجَهُمَا	مِمَّا	فَاَخْرَجَهُمَا	خارج، اخراج، وزیر خارجہ
پھر پھسلا دیا ان دونوں کو	شیطان نے	اس سے	اور نکلوا دیا ان دونوں کو	اس سے		
پھر ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا اور ان کو اس (حالت) سے نکلوا دیا						

كَانَا	فِيْهِ ۪	وَ	قُلْنَا	اهْبِطُوْا	بَعْضُكُمْ	لِبَعْضٍ	قُلْنَا	قول واقرار، اقوال زریں
تھے وہ دونوں	جس میں	تو	کہا ہم نے	تم اتر جاؤ	بعض تم میں سے	بعض کے		
جس میں وہ تھے تو ہم نے کہا تم (لوگ یہاں) سے اتر جاؤ۔ بعض تم میں سے بعض								

عَدُوٌّ	وَ	لَكُمْ	فِي الْاَرْضِ	مُسْتَقَرٌّ	وَّ	مَتَاعٌ	عَدُوٌّ	عداوت، تعدی، اعداء
دشمن ہیں	اور	تمہارے لیے	زمین میں	ٹھکانا	اور	سامان	مُسْتَقَرٌّ	قرار، استقرار، برقرار
کے دشمن ہیں اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا اور سامان (زندگی) ہے ایک وقت							مَتَاعٌ	مال ومتاع، متاع کارواں

اِلٰى حِيْنٍ ﴿36﴾	فَتَلَقّٰٓى	اٰدَمُ	مِنْ رَّبِّهٖ	كَلِمٰتٍ	فَتَابَ	كَلِمٰتٍ	کلمہ، کلمات، کلام، متکلم
ایک وقت تک	پھر سیکھ لیے	آدم نے	اپنے رب سے	چند کلمات	تو توبہ قبول کی	فَتَابَ	توبہ، تائب، تواب
(مقررہ) تک۔ پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے تو اللہ نے اس کی توبہ							

عَلَيْهِ	اِنَّهٗ	هُوَ	التَّوَّابُ	الرَّحِيْمُ ﴿37﴾	قُلْنَا	التَّوَّابُ	توبہ، تائب
اس کی	بے شک وہ	وہ	بہت توبہ قبول کرنے والا	بہت رحم کرنے والا ہے۔	ہم نے کہا	قُلْنَا	قول واقرار، اقوال زریں
قبول کرلی۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا							

اهْبِطُوْا	مِنْهَا	جَمِيْعًا	فَاِمَّا	يَاْتِيَنَّكُمْ	مِّنِّيْ	هُدًى	جَمِيْعًا	جماعت، مجمع، جمع، جمیع
تم اتر جاؤ	اس سے	سب	پھر جب	آئے تمہارے پاس	میری	ہدایت		
تم (سب) یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جب بھی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو								

فَمَنْ	تَبِعَ	هُدَايَ	فَلَا	خَوْفٌ	عَلَيْهِمْ	وَ	لَا	تَبِعَ	اتباع کرنا، تابع دار
تو جس نے	اتباع کیا	میری ہدایت کا	تو نہ	خوف	ان پر	اور	نہ	هُدَايَ	ہدایت، ہادی، مہدی
جنہوں نے میری ہدایت کا اتباع کیا تو انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور									

هُمْ	يَحْزَنُوْنَ ﴿38﴾	وَالَّذِيْنَ	كَفَرُوْا	وَكَذَّبُوْا	بِاٰيٰتِنَآ	يَحْزَنُوْنَ	غم وحزن، حزین، عام الحزن
وہ	غم کریں گے	مگر جنہوں نے	کفر کیا	اور جھٹلایا	ہماری نشانیوں کو	كَفَرُوْا	کفر، کافر، کفار، تکفیر
نہ غم۔ مگر جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا						كَذَّبُوْا	کذب، تکذیب، مسیلمہ کذاب

اُولٰٓئِكَ	اَصْحٰبُ النَّارِ	هُمْ	فِيْهَا	خٰلِدُوْنَ ﴿39﴾	اَصْحٰبُ	صحابی، صحابہ، اصحاب، صاحب
وہی ہیں	ساتھی آگ کے	وہ	اس میں	ہمیشہ رہیں گے	خٰلِدُوْنَ	خالد، خلود، خلد بریں
تو وہی (جہنم کی) آگ (میں جلیں گے) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔						

اہم نکات

حاصل کردہ سبق

① اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ کرنی چاہئیں اور جن سے روکا ہے ان سے رک جانا چاہیے۔

② شیطان ہمارا دشمن اور بدخواہ ہے، نافرمانی پر اکساتا ہے لہٰذا اس کی بات نہیں ماننی چاہیے۔

③ اگر غلطی ہو جائے اور اللہ کی نافرمانی ہو جائے تو شرمندگی محسوس کرنی چاہیے اور اللہ سے اس غلطی کی معافی مانگنی چاہیے۔ اور از سرنو اللہ کی اطاعت کا عہد کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ ضرور معاف فرما دیتا ہے کیونکہ اس نے خود کہا ہے کہ جو مجھ سے معافی مانگے میں بخوشی اس کو معاف کر دوں گا۔

ماہنامہ
البرہان
لاہور
Since 2010
جلد ۲۸
شمارہ ۱۱
برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk
نومبر ۲۰۲۴ء/ ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ

آئینہ مضامین

فکرونظر
طریقِ مجددی پر عمل کی ضرورت — مدیر — ۴
تعلیم وتربیت
- دینی مدارس میں عصری علوم بھی پڑھائے جائیں — مولانا سلیم اللہ خانؒ — ۵
- مسلم تعلیم: دو عالمی کانفرنسوں کی سفارشات — پروفیسر بختیار حسین صدیقیؒ — ۶
- تعبیرات اور مابعدالطبیعیات کا باہمی تعلق — محمد بلال — ۱۴
- نظام تعلیم وتربیت اور مسلم نشأۃ ثانیہ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۱۶
مدیر البرہان کی کتاب کی رونمائی
اسلام اور پاکستان
دستور میں اسلامی ترامیم بھی کی جائیں — ملی مجلس شرعی — ۱۸
تفہیم مغرب
امریکا میں صیہونی لابی کا کردار — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۲۰
فکرودانش
مصنوعی ذہانت - مثبت رُخ — مفتی منیب الرحمٰن — ۲۵
تفہیم دین
- نظم اجتماعی میں عورتوں کی شمولیت — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۲
- حق اور علمائے عزیمت — محمد بلال — ۳۶
تبصرۂ کتب وجرائد
ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۲۴ء — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۳۷
English Section — ۶۶
Orientalists' Influence on the Intellectual Framework of Jāved Ahmad Ghāmidī
Dr. Alam Khan

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکر و نظر

طریقِ مجددی پر عمل کی ضرورت

حضرت مجددؒ نے سیاست و ریاست میں اسلامی تبدیلی لانے کے لیے عوام الناس اور طبقۂ اشرافیہ کی اصلاح کا جو کامیاب طریقہ اپنایا جدید دینی تحریکوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے

جدید دینی تحریکوں کو اپنی حکمت عملی پر عمل کرتے ہوتے ہوئے تقریباً ایک صدی ہونے کو ہے لیکن انہیں اپنے ہدف میں کامیابی ملتی نظر نہیں آتی۔ ان کا منہج یہ تھا کہ غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش کی جائے اور اسلامی تبدیلی کے لیے خود ان کی جگہ لینے کی کوشش کی جائے تاکہ ریاستی اقتدار سے افراد اور معاشرے کی اصلاح کی جا سکے اور نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جا سکے۔

اس کے برعکس حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) نے اکبر جیسے بے دین حکمران کے مقابلے میں اس سے براہ راست ٹکر لینے کی بجائے عوام اور طبقۂ اشرافیہ کی اصلاح کا طریقہ اپنایا۔ اس کے باوجود وہ حکمرانوں کے جبر کا شکار ہوئے لیکن ایک ہی نسل کے بعد جہانگیر نے ان کی مخاصمت کا طریقہ ترک کر دیا اور دو نسلوں بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا دین پرور حکمران مسلمانانِ ہند کو نصیب ہوا۔ یہ طریقہ دیر طلب ضرور ہے لیکن اس کے نتیجے میں آنے والی تبدیلی دیرپا ہوتی ہے۔

جدید دینی تحریکوں کو چاہیے کہ وہ حضرت مجدد کے طریقِ اصلاحِ نظام کا مطالعہ کریں اور اس پر عمل کا سوچیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی قوموں نے جمہوریت اختیار کر کے حکومت کی تبدیلی کی راہ کھولی ہے، جو بظاہر ایک بڑی تبدیلی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس سے صَرفِ نظر نہیں کر سکتے کہ جدید دینی تحریکوں نے اس راستے سے تبدیلی کے لیے تقریباً سو سال تک جدوجہد کی ہے لیکن اس کے مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے، اس لیے متبادل حکمت عملی پر غور از بس ضروری ہے اور حضرت مجدد کی کامیاب حکمت عملی اس کی مستحق ہے کہ جدید دینی تحریکیں اس کا مطالعہ کریں اور اس پر عمل کریں تاکہ ریاست کی اسلامی اصلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

تعلیم وتربیت

مولانا سلیم اللہ خانؒ

دینی مدارس عصری علوم بھی پڑھائیں

''ہمارا یہ سمجھنا کہ صاحب! ہمارا کام تو قرآن پڑھانا ہے۔ ہمارا کام تو حدیث پڑھانا ہے۔ ہمارا کام تو فقہ پڑھانا ہے۔ مَیں آپ سے کب کہہ رہا ہوں کہ آپ قرآن کو چھوڑ کر انگریزی پڑھائیں؟ میں تو کہہ رہا ہوں کہ آپ قرآن ہی پڑھائیں! آپ حدیث ہی پڑھائیں! آپ فقہ ہی پڑھائیں لیکن انگریزی پڑھانے کا انتظام بھی کریں۔ آپ اپنا کام کریں گے اور آپ کے عصری علوم کے ماہرین اس خدمت کو انجام دیں گے۔ اور جہاں تک تربیت کا تعلق ہے تو آپ اپنے انفاس طیبہ سے، اپنی ہدایات اور رہنمائی سے، ان کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں۔ یہ بات انتہائی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات آپ کے حلق سے بہت مشکل سے اترے گی لیکن یہ اتارنی ضرور ہے۔ ہمیں اب اس کو بطور مہم آگے بڑھانا ہے۔ اس کے بغیر معاملات قابو میں نہیں آئیں گے۔ ہمیں ایسے رجال کار تیار کرنے ہیں جو خالص دین کے فدائی ہوں، عقل وخرد سے کام لینے والے ہوں اور اتنے بڑے پیمانے پر تیار کرنے ہیں جو تمام محکموں پر چھا جائیں۔ ظاہر ہے یہ دو سال، چار سال میں ہونے والا کام نہیں ہے۔ یہ طویل المدت منصوبہ ہے اور جب اس پر عمل شروع ہو جائے گا تو جن لوگوں کو یہ بات اب سمجھ میں نہیں آ رہی ان کی سمجھ میں بات آ جائے گی۔''

باطنی امراض نورِ علم سے محرومی کا سبب ہیں

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مَیں نے ایک مرتبہ اپنے استاذ وکیعؒ سے سوئے حفظ کی شکایت کی:

شَکَوْتُ اِلٰی وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِی فَاَوْصَانِیْ اِلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِی
فَاِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِنْ اِلٰہٖ وَنُوْرُ اللّٰہِ لَا یُعْطٰی لِعَاصِیْ

''مَیں نے اپنے استاد وکیع کے سامنے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی وصیت فرمائی اور کہا کہ بے شک علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے (جو انسان کو عطا کیا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا یہ نور گناہ گار کو عطا نہیں کیا جاتا۔''

(الفاروق کراچی)

تعلیم و تربیت

پروفیسر بختیار حسین صدیقیؒ

مسلم تعلیم: دو عالمی کانفرنسوں کی سفارشات

عصر حاضر کے مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم کا اصل مسئلہ عقلی علوم کو نقلی علوم سے ہم آہنگ کرنے کا ہے۔ اسے فوری طور پر حل کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہوا۔ عالم اسلام کے سامنے آج بھی سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اپنے دور اقتدار میں جو نظام تعلیم مختلف مسلم ممالک پر مسلط کیا تھا، آزاد ہونے کے بعد اب اسے بدلا کیسے جائے؟ ہر نو آزاد بلکہ عرصے سے آزاد مسلم ملک میں اس وقت دو نظام تعلیم رائج ہیں: ایک مدرسوں اور مکتبوں کا دینی نظام تعلیم اور دوسرا استعمار کا لایا ہوا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظام تعلیم۔ پہلی نوع کے اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا کا خالق خدا ہے۔ اس نے چھ دن میں زمین اور آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، اسے پیدا کیا۔ اس نے مٹی سے آدم کا خمیر تیار کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ وہ دنیا کا خالق ہی نہیں، اس کا ربّ اور پروردگار بھی ہے۔ اس نے سود لینا حرام قرار دیا ہے۔ دوسری نوع کے اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا کا نہ کوئی خالق ہے اور نہ پروردگار۔ یہ خود بخود بے جان مادے سے میکانکی قوانین کے تحت وجود میں آئی۔ زندگی نے کئی ارتقائی مراحل طے کیے یہاں تک کہ بندر سے انسان پیدا ہوا۔ سود سے پاک معیشت کا تصور ناممکن ہے۔

تعلیم کے ان دو مختلف بلکہ متضاد نظاموں نے مسلم معاشرے کو وحدت افکار اور وحدت کردار سے محروم کر دیا ہے اور وہ ''مسٹر'' اور ''مولانا'' کے دو طبقوں میں بٹ گیا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ ایک طبقہ اگر زندگی سے شریعت کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے، تو دوسرا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

مسلم تعلیم پر پہلی عالمی کانفرنس (مکۃ المکرمہ ۱۹۷۷ء)

موجودہ صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ نظام تعلیم کی دوعملی کو فوراً ختم کیا جائے۔ ان دو مختلف تعلیمی نظاموں کو ایک مربوط اور ہم آہنگ وحدانی نظامِ تعلیم میں اس طرح سمو یا جائے کہ

اس سے بہرہ ور ہو کر ملت اسلامیہ وحدت فکر وعمل کا ایک نمونہ بن جائے اور اس مسئلے کے حل کے لیے ملکی سطح پر نہیں بلکہ عالمی سطح پر مسلم ماہرین تعلیم کا تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا تعمیری قدم کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ نے اٹھایا اور ۳۱/ مارچ سے ۸/ اپریل ۱۹۷۷ء تک مکہ معظّمہ میں مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر پہلی عالمی کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ ''اسلامی معتقدات اور نصاب تعلیم'' کے موضوع پر مختلف مسلم ممالک کے مندوبین پر مشتمل اس بین الاقوامی سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے انہیں ورلڈ آف اسلام فیسٹیول پبلشنگ کمپنی لندن نے نفس مضمون کے اعتبار سے سات الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع کیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. Dr. Syed Naquib Al-Attas: Aims and Objectives of Islamic Education

2. Dr. Syed Sajid Hussain and Dr Syed Ali Ashraf: Crices in Muslim Education

3. Dr. Syed Ali Ashraf : Muslim Education in the Modern World

4. Dr. Wasi Ullah Khan: Education and society in the Modern World

5. Prof. Hameedul Afindi and Prof Nabi Bakhsh Baloch: Curriculum,Syllabi and Teacher

6. Dr. Seyyed Hossein Nasr: Philosophy , Literature and Fine Arts

7. Dr. Ismail R. Al-Farooqi and Dr Abdullah omer Naseef: Social and Natural Sciences, the Islamic perspective

پہلی عالمی کانفرنس کی سفارشات

پہلی تعلیمی کانفرنس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان کی روح، ذہن، نفس ناطقہ، احساسات اور بدنی حواس کی تربیت کے ذریعے اس کی پوری شخصیت کی نشوونما کرے۔ اس لیے تعلیم کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر انسان کے روحانی، ذہنی، تخیلی، جسمانی، سائنسی، لسانی ہر پہلو کی نشوونما کا اہتمام کرنا چاہیے اور ان تمام

پہلوؤں کو خبر وکمال کے حصوں کی لگن سے سرشار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی تعلیم کی غایت الغایات یہ ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور پوری نسل انسانی کی سطح پر اللہ کی مکمل اطاعت کا مقصد پورا ہو۔

نصاب ساز کا فرض یہ ہے کہ وہ مندرجہ بالا مقاصد کو اپنے سامنے رکھے اور جملہ علم کی، جو اس وقت موجود ہے، اس طرح تنظیم کرے کہ اس سے بہرہ ور ہونے والا ایک ایسا نیک اور متقی انسان بنے جو یہ کہنے پر آمادہ ہو کہ: اے میرے خدا! میری عبادت، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو عالموں کا پروردگار ہے اور جس کا کوئی ثانی نہیں۔''

علم کے دو ذریعے ہیں، ایک وحی اور دوسرا عقل۔ اس بنیاد پر کانفرنس کے شرکا نے تمام موجود علم کو ''ابدی'' اور اکتسابی'' علم میں تقسیم کیا۔ قرآن اور حدیث سے حاصل ہونے والے علم کو ''ابدی علم'' اور عقل وتجربے سے حاصل ہونے والے علم کو ''اکتسابی علم'' قرار دیا اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے ہم کنار کرنے پر زور دیا۔

مسلم تعلیم پر دوسری عالمی کانفرنس (اسلام آباد ۱۹۸۰ء)

پہلی تعلیمی کانفرنس میں جو کام ہوا تھا، اسے آگے بڑھانے کے لیے ۱۵، ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء مسلم تعلیم پر دوسری عالمی کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی کے تعاون سے اسلام آباد میں کیا۔ ''اسلامی معتقدات اور نصاب تعلیم'' پر اس دوسرے بین الاقوامی سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے، انہیں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے دو جلدوں میں جمع کیا ہے۔ کانفرنس نے جو سفارشات کی ہیں، انہیں انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک الگ کتابچے کی شکل دی ہے۔ مقالوں کی فہرست درج ذیل ہے:

1. Dr Syed Ali Ashraf: Islamic Curriculum for Muslim Education

2. Dr. Ilyas Bayunus:Socialogy in Islamic perspective

3. Dr. Asghar Ali Sheikh: Ibne Khaldoon's Educational Philosophy

4. Dr M Razi ud Din Siddiqui: Reformulation of courses for Scientific and Technology education in Muslim countries

5. Dr. N B Baloch : Curriculum Development at Tertiary level for General Education and Diversification

6. Dr Mukhtar Ahmed Bhatti: Principles of Curriculum Development in Islam

7. Dr Ahmad Saadali:New approach towards Islamic Education

8. Dr. Abdullah Omer Naseef: Science,Shariah and Education

9. Prof. Muhammad Qutb: The Concept of Islamic Education

10. Dr. Ismail R al Farooqi: Towards Islamizing higher education

11. Dr. Muhammad Abdullah Hijar alghamdi: Consideration for curriculum development in Islamic Education

12. Dr. A J Halipota: Inculcation of Islamic spirit through the study of natural and physical sciences

13. Dr. Syed Muhammad Naquib al-attas: The Concept of Education in Islam.

14. Dr. S. Waqar Ahmad Hoseini: Islamic engineering restructure, content , implementation and evaluation.

دوسری عالمی کانفرنس کی سفارشات

پہلی تعلیمی کانفرنس نے مسلمانوں کی تعلیم کے جو اغراض ومقاصد متعین کیے تھے،اس کی روشنی میں دوسری کانفرنس نے تمام موجود اکتسابی علم کو ابدی علم سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس بات پر زور دیا کہ اکتسابی علم کے ہر شعبے میں ایک اسلامی مدرسۂ فکر قائم کیا جائے جو ان علوم

کی تحقیقات کو اسلام کی ابدی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کا فرض انجام دے۔عقلی علوم کو نقلی علوم سے ہم آہنگ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک میں آج کل جو دو دو نظام تعلیم رائج ہیں، ان کو ایک وحدانی نظام تعلیم میں اس طرح سمو یا جائے کہ دونوں کے تمول میں اس سے اضافہ ہو اور کسی کو کسی قسم کا نقصان اس سے نہ پہنچے۔ایسے مربوط وحدانی نظام تعلیم سے بہرہ ور ہو کر ہی ملت اسلامیہ وحدتِ فکر و عمل کا نمونہ بن سکتی ہے۔

علم کی تقسیم دو گانہ کا اطلاق مجموعی حیثیت سے تمام علم پر ہوتا ہے۔ ہر علم مندرجہ بالا دو انواع میں سے کسی ایک نوع کے تحت آتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ابدی علم: اس کا اطلاق مندرجہ ذیل علوم پر ہوگا:

۱۔ قرآن حکیم: قراءت، حفظ اور تفسیر ۲۔ سنت نبوی

۳۔ سیرت النبی، سیرت صحابہ، سیرت تابعین ۴۔ توحید

۵۔ فقہ اور اصول فقہ

۶۔قرآنی عربی: علم الاصوات، علم الاعراب، علم الدلالات

۷۔ ذیلی علوم: اسلامی مابعد الطبیعیات، تقابل ادیان، اسلامی ثقافت

اکتسابی علم: اس کا اطلاق مندرجہ ذیل علوم پر ہوگا:

۱۔ فنون متخیلہ: فن تعمیر اور دوسرے اسلامی فنون۔ادب اور زبانیں

۲۔ علوم عقلیہ: عمرانی علوم (نظری)، فلسفہ، تعلیم، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ، اسلامی تہذیب (جس میں سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی اور جنگ وامن کے متعلق اسلامی نظریات شامل ہیں)، جغرافیہ، عمرانیات، لسانیات (زبانوں کو اسلامی رنگ دینا)، نفسیات (بالخصوص قرآن وحدیث کی روشنی میں نفس کا اسلامی تصور جس کی تحلیل اور توضیح ابتدائی دور کے مسلمان مفکرین اور صوفیائے کرام نے کی، بشریات (قرآن وسنت کی روشنی میں)۔

۳۔ علوم طبیعیہ: (نظری) فلسفۂ سائنس، ریاضی شماریات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیاتی علوم، فلکیات، خلائی علوم وغیرہ۔

۴۔ اطلاقی علوم: انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی (سول، بکینیکل وغیرہ۔علم العلاج: (طب، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، بیطاری)، زراعت اور جنگلات کی سائنس۔

۵۔ عملی علوم: کامرس، ایڈمنسٹریٹیو سائنسز (بزنس ایڈمنسٹریشن، پبلک ایڈمنسٹریشن وغیرہ) لائبریری سائنسز، امور خانہ داری سے متعلق، ابلاغی علوم (ابلاغ عامہ وغیرہ)۔

نصاب کی تدوین نو

ماہرین تعلیم کا اب کام یہ ہے کہ پہلے وہ ابدی اور اکتسابی علوم میں وسیع پیمانے پر ربط اور ہم آہنگی پیدا کریں اور پھر پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے درج ذیل نمونے کے مطابق نصاب مرتب کریں۔

پرائمری درجات کا نصاب

اس سطح پر نصاب مندرجہ ذیل علوم کے مطالعے پر مشتمل ہونا چاہیے:

۱۔ قرآن: ناظرہ، قراءت، حفظ

۲۔ دینیات: بشمول توحید وفقہ

۳۔ تاریخ: آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام معروف انبیاء کرام کے حالات زندگی، سیرۃ النبی، اسلامی تہذیب کی تاریخ۔

۴۔ کہانیاں اور نظمیں: ان کا موضوع دوستوں اور ہمسایوں سے ہمدردی، والدین اور بزرگوں کی اطاعت، انبیاء کرام، مشائخِ کبار، صوفیائے کرام، متقی اور پرہیز گار لوگوں کا احترام، اللہ کے حقوق کی ادائیگی کا احساس اور کوئی نیک کام کرنے کے لیے قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے۔

۵۔ جغرافیہ: اس کا مقصد دنیائے اسلام کے مرکز مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ سے ہمارے تعلق کا شعور، ان کے اردگرد کی دنیا اور اس کے باشندوں کا علم، امت مسلمہ اور نوع انسانی کی وحدت کا شعور، اسلامی دنیا کا مفہوم اور ہمارے اپنے ملک کا اس سے رشتہ کیسا ہونا چاہیے۔

۶۔ ریاضی: کھیلوں، معمول اور پھر سوالات کے ذریعے الجبرے کی علامتوں، جیومیٹری

کی شکلوں اور حساب کے اعداد کو کام میں لانا تاکہ ذہن کو مقرون اشیا سے مجرد تصورات کی طرف حرکت کی عادت ہو جائے اور کائنات کی ہر شے اللہ کی نشانی بن کر ذہن میں ابھرنے لگے۔

۷۔ عربی: غیر عرب بچوں کو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے تاکہ پرائمری کی چھ سالہ تعلیم کے اختتام پر قرآن کو سمجھنے میں زیادہ دقت نہ پیش آئے۔

۸۔ مطالعۂ قدرت اور ابتدائی سائنس: اس کا مقصد یہ ہے کہ کائنات کے اسرار، حُسن اور شان کے ذریعے اللہ کی قدرت، حکمت اور اس کے جلال و جمال کا شعور بچوں کے دل میں پیدا ہو۔ وہ سائنس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے لگیں، سادہ تجربات کر سکیں اور میکانکی اشیا کو استعمال کر سکیں۔

بچے جو کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں اس کی نقل کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے استاد کو چاہیے کہ وہ تقریر کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو بچوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کرے تاکہ ان کے دل میں اس کی نقل کرنے کی تحریک پیدا ہو۔ انسان نیکی کا علم حاصل کرنے سے نیک نہیں بنتا بلکہ نیک کام کرنے سے نیک بنتا ہے۔

ثانوی درجات کا نصاب

دین کے فہم اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب کی ثانوی سطح کے نصاب میں مرکزی حیثیت بدستور قائم رہنی چاہیے البتہ تقلید کے بجائے اب اصل زور دین کے عقلی فہم پر ہونا چاہیے۔ علم اور نیکی، علم اور عمل، علم اور طاقت، علم اور دولت، علم اور معاشرتی ماحول اور علم اور قومی ترقی میں جو رشتہ ہے طلبہ کو اس کا پورا شعور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ریاضی اور طبعی علوم کے کورسز کے ذریعے ذہن کو تیز کرنے، فن تعمیر اور دوسرے اسلامی فنون اور ادب کے کورسز کے ذریعے جذبات میں لطافت پیدا کرنے اور زبان اور معاشرتی مطالعہ جات کے کورسز کے ذریعے ابلاغی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل مضامین کا مطالعہ ثانوی سطح پر لازمی ہوگا:

۱۔ قرآن: قراءت، حفظ اور تفسیر

۲۔ حدیث: عمر، قابلیت اور ذہنی نشوونما کے مدارج کے مطابق منتخب احادیث کا مطالعہ

۳۔ سیرت اور تاریخ اسلام ۴۔ فقہ

۵۔ عربی زبان، مادی زبان/قومی زبان اور ایک یورپی زبان کا مطالعہ

۶۔ طبعی علوم میں سے کوئی ایک سائنس

۷۔ جغرافیہ: دنیا کے فزیکل اور تمدنی جغرافیہ، بالخصوص طالب علم کے اپنے ملک کے جغرافیہ کا مطالعہ۔

۸۔ تاریخ اور شہرت: تاریخ اسلام، بالخصوص طلباء کے اپنے اپنے ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ اور ان کی تہذیب وتمدن میں مسلمانوں کا حصہ۔

۹۔ پہلے تین سالوں میں مندرجہ بالا آٹھ لازمی مضامین پڑھائے جائیں گے۔ آخری تین سالوں میں ابدی علوم یا اکتسابی علوم میں سے دو مضامین یا ایک مضمون ابدی علوم میں سے اور ایک اکتسابی علوم میں سے لینا ہوگا۔

یونیورسٹی کا نصاب

اعلیٰ تعلیم کا مقصد اسلام اور مسلم معاشرے کا گہرا مطالعہ اور طلباء کی شخصیت کی متوازن نشوونما ہے۔ اس سطح پر ابدی یا اکتسابی علوم میں سے کسی ایک علم میں تخصص کا کورس کرنا ہوگا جو مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہوگا:

۱۔ ابدی علوم میں سے کسی دو علوم کے کورسز، جن میں ایک عربی زبان اور دوسرا اسلامی ثقافت اور تہذیب یا اسلامی فکر کی تاریخ کا کورس ہوگا۔

۲۔ اکتسابی علوم میں سے کسی دو علوم کے کورسز جن میں سے ایک اسلامی فلسفۂ سائنس اور دوسرا اسلامی فنون اور فن عمارت یا اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات میں سے کسی ایک مضمون کا کورس۔

تعلیم وتربیت

محمد بلال

تعبیرات اور مابعد الطبیعیات کا باہمی تعلق

یہ خیال کہ متون/نظریات کی تفہیم میں اپنے زمانے کے رائج یا غالب افکار کا کچھ اثر کارفرما نہیں ہوتا تعبیرات کی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی رویہ ہے۔ پھر ہر زمان و مکاں میں موجود متعدد مفکرین مختلف نظریات کے قائل ہوتے ہیں جس سے تعبیر میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ بطور مثال صرف مذہبی متون کی ہی ماقبل و مابعد استعمار تعبیرات پر ایک سرسری نظر کرنے سے بات واضح ہوسکتی ہے۔

پھر یہ بات کہ ہر تعبیر ایک منہاج میں رہ کے کی جاتی ہے جس کی اپنی مابعد الطبیعیات/ ایمانیات ہوتی ہیں جو کہ کسی نقد وفکر سے مبرا تسلیم شدہ اور ان پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں سمجھی جاتی، ایک حقیقت ہے۔ اس بنیادی نقطہ کو نظر انداز کر کے کارِ تفہیم کسی علمی بنیاد پر استوار نہیں ہو سکتا کیونکہ تجزیوں میں باہم فرق اسی جگہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی تعبیر کی کلی تفہیم وتنقید کا آغاز یہیں سے کرنا چاہیے۔ بصورت دیگر تاریخی طور پر کی گئی تنقیدات واختلافات پر ایک نظر عبرت کے لیے کافی ہے جس سے سطحیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک مبتدی قاری آخر تک اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے کہ متعدد تعبیرات میں سے کون سی تعبیر مبنی برحق ہے۔

معاملہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ مزید پیچیدہ ہے اور وہ ایسے کہ اکثر اوقات ایک ہی منہج کے حاملین اکثر مسائل کی تعبیر میں تو متفق ہوتے ہیں (یا اختلاف ہو بھی تو محض تنوع کا ہوتا ہے) لیکن اسی منہج کے کچھ دیگر مسائل میں ان کے ہاں بھی اختلاف وتضاد واقع ہو جاتا ہے جس کی وجہ اس مخصوص زیر بحث مسئلہ میں اپنے منہج سے سہو یا انحراف ہوتا ہے۔

مذکورہ اصولی گفتگو کو چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ:

۔ اگر کوئی مفکر سوشل ازم سے متاثر ہو تو وہ دینی متون کی تعبیر بھی اسی منہج میں کرے گا (مثل پرویز و دیگر)۔

۔اور اگر لبرل ازم سے متاثر ہو تو اس کی دینی تعبیر میں اسکے واضح ثبوت ملیں گے (غامدی اینڈ کمپنی)۔

۔اور اگر کوئی روایتی منہج کا عالم نادانستگی میں کسی جدید نظریے سے متاثر ہو اور اس کو اس چیز کا علم نہ ہو تو بھی وہ بیشتر مسائل میں روایتی تعبیر اختیار کرنے کے بعد چند جدید مسائل میں غالب نظریات کے تحت ہی تعبیر اختیار کرے گا (جس کی صریح مثالیں اسلامی جمہوریت، اسلامی بینکنگ، اسلامی اسکول و دیگر جدید مسائل کو مشرف بہ ''اسلام'' کرنے جیسے امور ہیں)۔

۔ایک مثال اسلامی تاریخ کی استعماری تعبیر بھی ہو سکتی ہے (جس کے مختلف ورژنز ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں)۔

ان تمام تعبیرات کی کلی تفہیم تب ہی ممکن ہے جب آپ اولاً اپنے اور ثانیاً غالب مناہج کی مابعد الطبیعیات اور علمی، فکری و تہذیبی تاریخ سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

محمد بلال

ہیومن ازم کے عقیدے (Freedom, Progress, Equality) سے نکلنے والی علمیت (Physical & Social Sciences) جہاں جدیدیت کے اہداف طے شدہ ہیں اور اس پر مبنی ادارتی صف بندی School, Financial Market, Entertainment Industry وغیرہ، جس کا مقصد ان اہداف کا حصول بذریعہ ایک ایسا عملی طریقہ جو جدیدیت کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو، سے یہ توقع کرنا کہ وہ عبدیت کے تقاضے، اہداف اور مقاصد کو پورا کر سکتی ہے یا جزوی ترمیم کے بعد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے سوائے جہالت کے کچھ نہیں اور افسوس کہ اس جہالت کا ارتکاب وہ لوگ کر رہے ہیں جو اس جاہلیت جدیدہ کی حقیقت سے کلی واقفیت نہیں رکھتے اور ان کے اخلاص میں شک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

صحیح نظامِ تعلیم و تربیت ہی مسلمانوں کو عروج سے ہمکنار کرسکتا ہے

مدیر البرہان کی کتاب 'عروجِ امت مسلمہ' کی تقریب رونمائی سے اہل علم کے خطابات

۴/اکتوبر ۲۰۲۴ء کو قائد اعظم لائبریری لاہور میں مجلس فکر و نظر کی جانب سے پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی کتاب 'عروجِ اُمت مسلمہ' کے تیسرے نظر ثانی ایڈیشن کی رونمائی کی تقریب رکھی گئی۔ یہ کتاب مسلم نشأۃ ثانیہ کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ بھارت میں بھی زیر طبع ہے۔ کتاب کا موضوع یہ ہے کہ مسلمان ابھی تک زوال سے کیوں نہیں نکل سکے اور کیسے نکل سکتے ہیں؟ مغرب کیوں غالب ہے؟ تقریب کی صدارت ڈاکٹر اسرار احمد کے برادر خورد سابق صدر شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر ابصار احمد نے فرمائی۔ تعارفی کلمات میں پروفیسر ڈاکٹر امین صاحب نے معزز شرکاء اور ممتاز دانشوروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بتایا کہ ہمارے زوال کے دو بڑے اسباب ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے نظریہ حیات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ آسمانی ہدایت سے مملو نظریہ حیات ہی تو تھا جس نے عرب کے بادیہ نشینوں کو حکمرانی کے آداب سکھائے تھے اور دو سپر پاور قیصر و کسریٰ کو ان کے زیر نگیں کر دیا تھا۔ آج دنیا کی محبت ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ کوئی قوم اگر اپنے نظریہ حیات پر عمل چھوڑ دے تو اسے زوال سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ دوسرا خارجی سبب اپنوں اور غیروں کی عیاریاں ہیں تاہم اللہ کا وعدہ ہے کہ ہم اگر سچے مسلمان ہوں گے تو ہم ہی غالب ہوں گے ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝١٣٩﴾ [آل عمران ۳:۱۳۹]

ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی صاحب ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجھے ڈاکٹر امین صاحب کی کتاب دیکھ کر حد درجہ خوشی ہوئی۔ مَیں فکر اقبال کا طالب علم ہوں۔ علامہ اقبال کی فکر کو نثر میں نہایت علمی اسلوب میں ڈاکٹر صاحب نے پیش کر کے کمال کر دیا ہے۔ امت کے مرض کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے۔ عروج کے ممکنہ امکانات پر دلائل بھی حیران کن ہیں۔ علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر امین صاحب بھی مایوس نہیں ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ڈاکٹر رشید ارشد صاحب نے کہا 'عروجِ اُمت مسلمہ' کے لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ آسمانی ہدایت ونظریۂ حیات سے وابستگی کے بغیر عروج ممکن نہیں، بالکل بجا ہے۔ یہ قرآنی فیصلے ہیں ان کو کسی طور پر جھٹلایا نہیں جاسکتا تاہم اپنے رقیبوں کی حرکات پر نظر نہ رکھنا یہ بھی ہمیں لے ڈوبا۔ سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ۔ تاہم عروج امت مسلمہ کے مناہج پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر جاوید یونس اوپل صاحب نے کہا کہ نظام تعلیم وتربیت کو مؤثر بنائے بغیر ملی تعمیر نو کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی لہٰذا اُمت مسلمہ کو تعلیم وتزکیہ کو بنیادی اہمیت دے کر موزوں ادارے بنانا ہوں گے۔

دار ارقم سکولوں کے سربراہ سید وقاص جعفری صاحب نے کہا کہ میں تو ڈاکٹر امین صاحب کو اپنا استاد کہتا ہوں۔ زندگی کے بہت سارے معاملات میں مَیں ان کی فکر سے مستفید ہوا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، یکہ تاز شخصیت ہیں، ملک وملت کے لیے دردرکھتے ہیں اور مغربی فکر کے نقاد ہیں۔ آپ جیسے بزرگ ہمارے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں ہم سب کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔ خدا ان کا سایہ تادیر سلامت رکھے۔ تقریب کے مہمان خصوصی منیب علیم اعوان صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے جذبات واحساسات کو سراہا اور کہا کہ حالات تیسری عالمی جنگ کی طرف جارہے ہیں۔ ہم نے اس کی کوئی تیاری نہیں کی۔ قیامت سے پہلے اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا اس کے اثار 11/9 سے شروع ہو چکے ہیں۔ اسلام دنیا میں بہت زیادہ پھیلنے والا دین بن چکا ہے۔ دوسری قوموں کو اس آسمانی ہدایت کا انعام مل رہا ہے مگر ہم آسمانی ہدایت کے علمبردار ان مغرب والوں سے مرعوب ہیں۔ اللہ کرے ہم باکردار مسلمان بنیں اور خدا کی رحمتوں اور آسمانی برکات کے دروازے ہم پر کھلیں۔

صدارتی کلمات میں ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے کہا کہ اگرچہ پیرانہ سالی کے سبب اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ ایسی تقاریب میں دیر تک بیٹھ سکوں مگر ڈاکٹر صاحب کی جواں ہمت دیکھ کر مجھ میں بھی جوانی عود کر آتی ہے۔ صدتبریک کے لائق ہیں ڈاکٹر صاحب کہ علمی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ ان کا جذبہ سلامت رکھے۔ مہمانوں کے شکریہ کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

اسلام اور پاکستان ملی مجلس شرعی

دستور میں اسلامی ترامیم بھی کی جائیں

ملی مجلس شرعی، جو سارے دینی مکاتب فکر کا مشترکہ علمی پلیٹ فارم ہے، اس کے صدر مولانا زاہد الراشدی، سیکرٹری جنرل ڈاکٹر محمد امین اور دیگر علماء کرام مولانا سردار محمد خاں لغاری، حافظ عبد الغفار روپڑی، مولانا عبد المالک اور حکومتی دستوری ترامیم پر غور کرنے اور دستور میں اسلامی ترامیم تجویز کرنے والی کمیٹی کے ارکان ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مولانا غضنفر عزیز اور حافظ محمد عمران طحاوی نے حکومتی ترامیم کے بارے میں یہ رائے دی کہ حکومت کے پیش نظر اس کی سیاسی اور وقتی ضرورتیں ہیں اور عدلیہ کے ان ججوں کی حمایت وتوسیع ہے جو اس کے حامی ہیں اور ان سے نمٹنا مقصود ہے جو حکومتی رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان تجاویز سے وفاق کو اور سیاسی وعدالتی نظام کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے لہٰذا دینی قوتوں کو ان ترامیم کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔

ان علماء کرام نے تجویز کیا کہ دینی قوتوں کو دستور کے اسلامی پہلو کو مؤثر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل ترامیم پیش کرنی چاہئیں:

۱۔ قرارداد مقاصد کو دیگر قوانین پر بالادستی دی جائے اور دستور واسلامی تعلیمات میں تعارض کی صورت میں اسلامی تعلیمات پر ترجیحاً عمل کیا جائے۔

۲۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں پر عمل درآمد کیا جائے، ان کے خلاف اپیل کو stay نہ سمجھا جائے اور اپیل کا فیصلہ تین ماہ کے اندر کیا جائے۔ عدالت میں علماء ججوں کی تعداد بڑھائی جائے اور ان کے حقوق واختیارات وہی ہوں جو دوسرے ہائی کورٹ ججز کے ہیں۔

۳۔ بنیادی حقوق کی دفعہ 8 میں اضافہ کر کے ان پر عمل درآمد کو قرآن وسنت کی مطابقت سے مشروط کیا جائے۔

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے طریقِ کار وضع کیا جائے

اور عمل نہ کرنے کی صورت میں سپیکر اور وزیر قانون قابل مواخذہ اور قابل سزا ہوں۔

۵۔ سپریم کورٹ شریعت اپیلیٹ بنچ کو ریگولر سماعت کرنی چاہیے اور اہم زیر التوا معاملات جیسے ربا، ٹرانس جینڈر، اوقاف ایکٹ وغیرہ کے بارے میں فیصلے فوری کیے جائیں۔

۶۔ سزائے موت کی معافی کا صدارتی اختیار (دفعہ 245) ختم کیا جائے کہ یہ اختیار غیر شرعی ہے۔

۷۔ سماجی برائیوں کے خاتمے کی دفعہ 37 پر مکمل عمل کیا جائے اور ان پر عمل درآمد کو قرآن وسنت کی مطابقت سے مشروط کیا جائے۔

ناقابل اشاعت

۱۔ شمس الحق صاحب کا مضمون جو انہوں نے جمعیت علماء اسلام (ف) کے خلاف لکھا ہے اور مولانا فضل الرحمٰن کو عیار، دوغلا اور منافق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے آئینی ترامیم کے حوالے سے بیک وقت اپوزیشن اور حکومت کو دھوکا دیا ہے۔

۲۔ رحیم الدین صاحب کا مضمون جو انہوں نے اہل تشیع کے خلاف لکھا ہے کہ انہوں نے پاکستان کی سول اور ملٹری سروسز اور انتظامیہ میں پلاننگ سے اہم پوسٹوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور سارے اہم شہروں کے داخلی اور خارجی راستوں پر منصوبہ بندی سے اپنی بستیاں قائم کر رکھی ہیں اور وہ کسی مناسب وقت پر بزورِ بازو پاکستان میں شیعہ انقلاب لانے کی تاک میں ہیں۔

ہم البرہان کے لیے لکھنے والوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہم بین المسالک ہم آہنگی کے فروغ کے حامی ہیں لہٰذا کسی دینی مسلک یا دینی جماعت کے خلاف مضمون البرہان میں شائع نہیں ہوسکتا۔

تفہیم مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

امریکا میں صہیونی لابی کا کردار

کرہ ارض پر اسلام کا سب سے بڑا دشمن امریکا ہے۔ اس دشمنی کے اظہار کے کئی طریقے ہیں جن میں سب سے نمایاں آج کل امریکا کی اسرائیل نوازی ہے۔ امریکا پوری طرح اسرائیل کی غزہ اور لبنان کے خلاف دہشت گردی میں شریک ہے۔ اور اگر غزہ اور فلسطین میں جہاد پھیلا تو اس کو کچلنے کے لیے امریکا ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ امریکی اسرائیلی گٹھ جوڑ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان وجوہات کی نشان دہی کی جائے جن کی بنا پر یہ گٹھ جوڑ دیرپا ثابت ہوا ہے۔ اس گٹھ جوڑ کو کارفرما رکھنے میں امریکا میں موجود اسرائیلی حمایتی دھڑے (لابی) کی شناخت ضروری ہے۔

امریکہ کی اسرائیل کی حمایت کی وجوہات

اسرائیل ایک صہیونی ریاست ہے۔ اس کا قدیم یہودی ریاستوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات کو بہت سے مذہبی یہودی رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ صہیونیت انیسویں صدی کے آخر میں وجود میں آنے والا ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے جس نے یہودی مذہبی تعلیمات کو مسخ کر کے قوم پرستی کے قالب میں ڈھالا۔ جس طرح کہ آج ہندوتوا ہندومت کو مسخ کر رہا ہے۔ صہیونیت فاشزم کی تشریح نو ہے جو امریکا اسرائیل کا فطری حلیف ہے۔ دونوں نوآبادیاتی ریاستیں ہیں۔ اگر آج اسرائیل لاکھوں مسلمانوں کو قتل اور بے دخل کر رہا ہے تو یہ اس قتل عام کا تسلسل ہے جو امریکا نے آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں (Red Indians) کے قتل عام سے تین صدیوں تک جاری رکھا اور جس کے نتیجے میں اس نے لوٹ مار کے ذریعے ایک پورے براعظم پر قبضہ کر لیا۔ امریکا اور اسرائیل اپنے علاقے کے قدیم باشندوں کو قتل کرنا، ان کے املاک اور اراضی پر قبضہ اپنا موروثی حق تصور کرتے ہیں۔

امریکا اور اسرائیل دونوں کو یہ احساس ہے کہ جمہوری عمل کا پھیلاؤ اس چیز کا متقاضی ہے کہ کروڑوں مسلمانوں اور قدیم امریکی باشندوں کو قتل کیا جائے۔ ریڈ انڈینوں کے قتل عام کی بھرپور حمایت امریکی عوام نے تین صدیوں تک کی تھی۔ آج اسی طرح اسرائیلی عوام بھی

مسلمانوں کے قتل عام کو ملک میں جمہوری تحکم کے عام کرنے کا لازمی ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان معنوں میں اسرائیلی جمہوریت، امریکی جمہوریت کا تسلسل ہے اور امریکی جمہوریت کی صہیونیت نوازی کا ہی بنیادی سبب ہے۔ امریکا کو اس کا یقین ہے کہ اسرائیل میں جمہوری عمل مکمل نہیں ہوسکتا جب تک تمام مسلمان قتل یا بے دخل نہ کر دیے جائیں۔ غزہ اور لبنان میں جاری قتل عام امریکی جمہوری عمل کا ایک تاریخی اظہار اور ہیومن رائٹس پر عمل درآمد کرنے کا طریقہ ہے۔ کل امریکی صدر ریڈ انڈینز کو بھیڑیے کہتا تھا آج اسرائیلی وزیر دفاع مسلمانوں کو "جنگلی جانور" کہتا ہے۔ اور ہیومن رائٹس کی تعلیم ہے کہ بھیڑیوں اور جنگلی جانوروں کو قتل کرنا ہیومن بی اِنگ کا فرض ہے۔ یہ قتل عام امریکا کی سافٹ پاور کا بھی ایک اظہار ہے۔ آج تک (اکتوبر 2024ء) اسرائیل نے پچاس ہزار کے لگ بھگ مسلمان قتل کیے ہیں۔ امریکا نے آٹھ کروڑ ریڈ انڈینز کو قتل کیا تھا۔ اسرائیل عزم رکھتا ہے کہ وہ غزہ، مغربی علاقے اور پورے فلسطین میں تمام مسلمانوں کو قتل کر دے تو ہی وہاں جمہوری نظام پنپ سکتا ہے۔ نیتن یاہو کہتا ہے کہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں کسی کو نہ چھوڑو سب کو قتل کر دو۔ میجر جنرل غسان کہتا ہے غزہ کو جہنم بنا دو۔ وزیر دفاع Yaow Gullant کہتا ہے ہم جنگلی جانوروں سے لڑ رہے ہیں اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا ہی سلوک کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے تاکہ غزہ کی اراضی پر اسرائیل کا قبضہ ہو جائے۔

بائیڈن کہتا ہے میں صہیونی ہوں اور اسرائیل کی خدمت کرتا رہوں گا۔ امریکہ کی اسرائیلی حمایت کی چار بنیادی وجوہات ہیں:

۱۔ امریکا میں موجود صہیونی لابی کی کارفرمائی

۲۔ امریکا کی مشرق وسطیٰ میں بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے ایک جارحانہ نیوکالونی کے وجود کی اہمیت ۳۔ عالمی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کے اسرائیل سے روابط

۴۔ امریکی جمہوری نظام میں صہیونی پیوستگی

اس مضمون میں ہم صہیونی لابی کی نوعیت اور اس کی کارفرمائی زیر بحث لائیں گے۔

امریکی صہیونی لابی

یہ لابی کئی اداروں پر مشتمل ہے۔ ہر ادارہ کی مخصوص ذمہ داریاں ہیں اور کوئی بالائی

مرکزی قیادت نظر نہیں آتی۔ لابی کے چیدہ چیدہ ادارے حسب ذیل ہیں۔

1.America Israel Public Affairs Committee (AIPAC)
2.Conferene of Presidents of Major American Jewish Organizations (CPMAJO)
3.Washington Institute for Near East Policy (WINE)
4.The Anti-Defamation League (ADL)
5.The Jewish Institute for National Security of America (JINSN)
6.The Middle East Forum (MEF)
7.The Zionist Organization of America (ZOA)
8.Christians United for Israel (CUI)

ان تمام تنظیموں کے گہرے روابط امریکا کے مرکزی خارجہ پالیسی ساز ادارے کونسل آف فارن ریلیشنز (CFR) سے ہیں جو ایک نجی ادارہ ہے۔ اسے وال سٹریٹ کا تھنک ٹینک بھی کہا جاتا ہے۔ امریکا کی نائب صدر اور اس کے خاندان کے کئی افراد CFR کے رکن ہیں۔ CFR ایک نہایت طاقت ور ادارہ ہے جو امریکی ریاستی اور اقتصادی اشرافیہ میں روابط قائم رکھنے، ان کے مفادات کا دفاع کرنے اور امریکی خارجہ پالیسی سازی کے عمل کو متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ حقیقتاً CFR بھی صہیونی لابی کا حصہ ہے۔ وہ امریکا کی صہیونیت نوازی کو فروغ دینے میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

CFR کے بعد صہیونی لابی کا دوسرا سب سے طاقت ور ادارہ American Council of Public Affairs Committee ہے۔ وہ سیاست دانوں سے مشاورت کرنے اور ان کی مالی اعانت کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہ امریکی مقننہ کے دونوں ایوانوں کے ممبران کی نگرانی پر توجہ دیتا ہے۔ اس قسم کی نگرانی ریاستی انتظامیہ کرتی ہے۔ کئی افراد CFR اور AIPAC کے مشترکہ ممبر ہیں۔ غزہ کے جہاد کے دوران AIPAC نے اسرائیلی حمایت کو فروغ دینے کے لیے بڑے پیمانے پر پیسہ جمع کیا۔ پیسہ جمع کرنے کی یہ مہم آج بھی جاری ہے اور بڑے چندہ دینے والوں میں Apollo Global Management, Blackstreet Private Equity اور Goldman Sachs

کے نمائندے شامل ہیں۔

اسی طرح Washington Institute for Near East Policy بھی CFR سے قریبی رابطہ رکھتا ہے۔ 2020ء میں اس ادارہ کے Board of Advisors کے ۱۷ ارکان میں سے CFR کے ۱۵ ارکان تھے۔ Anti Defamation League اسرائیل کے لیے امریکا میں مخبری کے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس کا سربراہ اور ریجنل ڈائریکٹر دونوں CFR کے ممبر ہیں۔ Jewish Institute for National Security of America امریکی مشرق وسطیٰ کی پالیسی سازی کی نگرانی کرتا ہے اور پیہم جستجو کرتا ہے کہ امریکا اور اسرائیل میں ایک Natural Defence Treaty وضع کیا جائے۔ CFR کے ۶ ممبرز JINSA میں شامل ہیں اور اس کی US-Israel Security Task Force کا حالیہ سربراہ CFR کا سابق ڈائریکٹر رہ چکا ہے۔ اسی طرح Middle East Forum کا حالیہ سربراہ بھی CFR کا رکن ہے۔ MEF کی خاص ذمہ داری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اسرائیلی حمایت کو فروغ دینا ہے۔

CFR نے ایک ذیلی تنظیم جس کا نام بھی CFR ہے اسرائیل میں قائم کی ہے۔ اسرائیلی اطلاعاتی ادارے موساد کا سابق ڈائریکٹر اسرائیلی CFR کا سربراہ ہے اور وہ AIPAC کا رکن بھی ہے۔ اوباما سرکار نے ایرانی نژاد فرح بنارتھ کو مسلم اقلیت سے تعاون بڑھانے کے لیے ڈائریکٹر نامزد کیا جو Anti Defamation League کی مشیر ہے۔

صہیونی لابی کی معاشی اور سیاسی گرفت

CFR اور صہیونی لابی امریکا کی اسرائیل نوازی کے فروغ کے لیے جو بیانیہ مرتب کرتی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اسرائیل امریکا کا سب سے قریب تزویراتی حلیف ہے جو امریکا کو مستقل علاقائی بالادستی فراہم کرنے کے لیے اطلاعات اور سہولتیں فراہم کرتا رہتا ہے اور جس کی فوج عملاً امریکی دفاعی نظام کا جزو ہے۔

۲۔ امریکا اسرائیل سے فوجی ٹیکنالوجی بالخصوص سائبر سکیورٹی کے وسائل حاصل کرتا ہے۔

۳۔ اسرائیل امریکا میں سب سے بڑا سرمایہ کار ہے۔

۴۔ اسرائیل امریکا کے ہائی ٹیک سیکٹر کا کلیدی حلیف ہے اور دونوں میں سائنٹفک اور تکنیکی تعاون تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔

خلاصہیہ کہ اسرائیل کی پشت پناہی اور تعاون کو فروغ دینا صرف مشرق وسطیٰ میں نہیں پوری دنیا میں امریکی سامراجی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ اس تزویراتی سیاسی حقیقت کا ادراک امریکی سرمایہ کاروں کو خوب ہو چکا ہے۔ امریکا اور دنیا کی سب سے بڑی سٹہ باز (asset management) کمپنی Blackstreet اسرائیل میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ Blackstreet اسرائیلی کمپنی Altsxhular Shakkan کی ساجھے دار سرمایہ کار ہے۔

کئی امریکی کمپنیاں اسرائیل میں موجود ہیں۔ Blackstreet کے علاوہ کئی کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ 2022ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ 2700 سے زیادہ امریکی کمپنیاں، جنھوں نے تقریباً ایک لاکھ اسرائیلی شہری ملازم رکھے ہیں، اسرائیل میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ان میں شیوران اور انٹل نمایاں ہیں۔ شیوران بڑے پیمانے پر اسرائیل میں تیل اور گیس کی تلاش اور ترسیل جاری رکھے ہوئے ہے۔ گیس کے ذخائر غزہ کے بہت قریب ہیں اور ان میں کام جاری رکھنے کے لیے غزہ کا قتل عام ناگزیر ہے۔

اسرائیلی لابی امریکی جمہوری عمل کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بھرپور طور پر استعمال کر رہی ہے۔ ووٹوں کی خرید و فروخت اس جمہوری عمل کا خاصہ ہے۔ ڈیموکریٹ اور ریپبلکن امیدواروں کی رشوتی اعانت میں تمام صہیونی لابی کے ادارے پیش پیش ہیں اور بڑے سرمایہ دارانہ اداروں نے کھلے دل سے چندہ حالیہ انتخابات کے لیے دیا ہے۔ Bloomsberg کا گروپ شاید سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے اور ڈیموکریٹ پارٹی کو تقریباً سو ملین ڈالر دے چکا ہے۔

امریکا کا سیاسی نظام دنیا کا سب سے کرپٹ، غلیظ اور جعل ساز نظام ہے۔ اس نظام نے ایک چھوٹے سے تخریب کار گروہ یعنی صہیونی لابی کے لیے ممکن بنا دیا ہے کہ وہ امریکی عوام کو یرغمال بنا کر لیں اور ایک چھوٹی سی کمزور نوآبادیاتی ریاست (اسرائیل) کو امریکی ریاستی فیصلہ سازی کے عمل پر کئی دہائیوں تک تسلط قائم رکھنے کا اہل بنا دیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۶)

فکرودانش

مفتی منیب الرحمٰن

مصنوعی ذہانت ۔مثبت رُخ

مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) ایک حقیقت ہے، خواستہ وناخواستہ سب کواس سے استفادہ کرنا ہوگا،لیکن اسے کاملیت تک پہنچنے کے لیے وقت درکار ہے، کیونکہ بعض حضرات نے کسی کا مصنوعی ذہانت کے ذریعے پروفائل نکالا تو اس میں سب کچھ مِن وعَن تازہ ترین حقائق کے مطابق نہیں تھا۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ تخلیق (پیدا کرنا)، اِحیاء (حیات عطا کرنا) اور اِمَاتَت (حیات کو سلب کرنا) اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جبکہ سائنسدان کائنات کے سربستہ رازوں کو دریافت (Discover & Explore) کرتا ہے۔ الغرض درحقیقت سائنسدان خالق، مُحیِیْ اور مُمِیت نہیں ہیں، بعض اوقات انسانوں کے لیے یہ الفاظ مجازاً بولے جاتے ہیں۔

انسان اور مصنوعی ذہانت، ایک مضبوط تعلق

آج کل AI کی تیز رفتار ترقی سے یہ بحث عام ہوگئی ہے کہ کیا AI انسانوں کی جگہ لے لی گی؟ ایک گزشتہ کالم میں ہم نے AI کے منفی پہلوؤں پر گفتگو کی تھی مگر ڈاکٹر محمد معظم فراز سیفی مصنوعی ذہانت کو مثبت انداز میں لیتے ہوئے کہتے ہیں: کیا انسان نے کبھی سوچا تھا کہ ایک مشین اس سے بات کرسکتی ہے، اس کی ذاتی ضروریات کو سمجھ سکتی ہے، بلکہ اس کی مدد بھی کرسکتی ہے۔ یہ سائنسی فلموں کا تصور نہیں، بلکہ ہمارے موجودہ دور کی حقیقت ہے۔ AI ایک ایسا تیزی سے ترقی پذیر شعبہ ہے جو کمپیوٹر سائنس اور ریاضی کے اصولوں کو استعمال کرکے ایسی مشینوں کو بنانے پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو انسانی ذہانت کی طرح سیکھنے اور فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ مشینیں بڑے پیمانے پر موجودہ ڈیٹا کا تجزیہ کرکے اشیا کو سمجھنے اور اس کے مطابق ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنوعی ذہانت ابھی ابتدائی مراحل میں ہے لیکن اس کا اثر ہر شعبے میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ AI انسان کی جگہ لینے کی اہل نہیں ہے، بلکہ اس کی معاون ومددگار

ہے۔ یہ ہمیں بہتر فیصلے کرنے اور ہر شعبہ زندگی میں ترقی اور کارکردگی بڑھانے میں مدد دے گی۔AI بیشمار اعداد وشمار کا تجزیہ کرتے ہوئے پیچیدہ مسائل کو حل کر کے وہ کام کم وقت میں غلطیوں کے بغیر کرسکتی ہے جس کے لیے انسان کو زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔اس سے ہر شعبے میں کام کی رفتار اور درستی میں اضافہ ہوگا۔ بار بار دہرانے والے اور خطرناک کاموں کیلئے AI کا استعمال انسانی خطرات کو کم کرے گا مثلاً فیکٹریوں میں روبوٹس کا استعمال یا خطرناک علاقوں میں معلومات جمع کرنے کے لیے ڈرونز کا استعمال۔ نیز AI وسیع تر اعداد وشمار اور ماضی کے رجحانات کا تجزیہ کر کے انسانوں کو بہتر فیصلے کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ ڈاکٹروں کو بیماریوں کی تشخیص میں، کمپنیوں کو منصوبہ بندی میں اور حکومتوں کو پالیسی بنانے میں AI سے مدد مل سکتی ہے۔ انسانوں کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوگی۔ فی الحال AI تخلیقی نہیں ہوسکتی' نئی چیزیں ایجاد کرنا، فن پارے تخلیق کرنا اور تخیلاتی سوچ کا استعمال کرنا صرف انسانوں ہی کا کام ہے،AI ان صلاحیتوں کو بڑھا سکتی ہے لیکن ان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اخلاق واقدار پر مبنی فیصلے کرنے کی صلاحیت صرف انسانوں میں ہوتی ہے۔AI اخلاقی پیچیدگیوں کو سمجھ سکتی ہے اور نہ اس میں انسانوں جیسے جذبات ہوتے ہیں، پس اگر کسی مسئلے کے متعدد حل تجویز کیے گئے ہوں تو اخلاقی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اُن میں سے کسی ایک حل کے انتخاب میں فیصلہ کُن کردار انسان ہی کا ہوگا۔

AI انسانوں کے درمیان تعلقات کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ہماری زندگیوں میں ہمدردی، محبت اور دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت بہت اہم ہے۔AI اس کی تقلید کرسکتی ہے، لیکن اس میں حقیقی جذبات نہیں ہوتے۔ انسان اور AI کا تعاون ہر شعبے میں ترقی اور خوشحالی کا باعث بن سکتا ہے، یہ تیزی سے ترقی پذیر شعبہ ہے جو ہماری زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کر رہا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کارکردگی اور پیداوار بڑھانے، درست فیصلے کرنے اور نئی دریافت کرنے میں ہماری مدد کر رہی ہے۔صحت، تعلیم، مصنوعات بنانے اور موسمیاتی تبدیلی جیسے مختلف شعبوں میں مصنوعی ذہانت انقلاب برپا کر رہی ہے، اس کے ساتھ ہی یہ نئی ملازمتیں بھی پیدا کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر مصنوعی ذہانت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کا عقلمندی، دوراندیشی اور ذمہ داری

سے استعمال کر کے ہم اپنی دنیا کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے: ''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے (سب کو) پیدا کیا' اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، آپ پڑھیے! آپ کا رب ہی سب سے زیادہ کریم ہے، جس نے قلم سے (لکھنا) سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا' (العلق: 1 تا 5)۔ ہم قلم کو اُن تمام آلات کے لیے استعارے کے طور پر لے سکتے ہیں جو آج حصولِ علم میں معاون ہیں۔ یہ آیات مبارکہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ علم کا سرچشمہ اور بنیاد قرآن مجید ہے۔ اسلام علم کی ترغیب دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کے غلبے کے دور میں مسلمان ہر شعبۂ علم میں سرخیل تھے۔ مسلمان سائنسدانوں نے فلکیات، طب، ریاضی، ہندسہ اور دیگر علوم میں انقلابی کام کیا تھا۔ مغرب نے ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کی انہی تحقیقات پر رکھی ہے اور پھر اُنہیں عروج تک پہنچایا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے اپنے دین سے دوری اختیار کر لی ہے، جس کی وجہ سے وہ ہر شعبے میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ موجودہ دور کا تقاضا ہے کہ ہم دینی اور عصری تعلیم کو ہم آہنگی کے ساتھ حاصل کریں، دینی تعلیم ہمیں خالق کی معرفت، خالق اور مخلوق کے ساتھ تعلق کی حدود اور اخلاقیات سکھاتی ہے جبکہ عصری تعلیم ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے آگاہ کرتی ہے۔ دینی اور عصری علوم کے امتزاج سے انسان میں مثبت سوچ پیدا ہوتی ہے اور وہ مصنوعی ذہانت اور ٹیکنالوجی کو ذمہ داری سے استعمال کرنے کی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں سائنس اور مصنوعی ذہانت سے متعلقہ علوم کو شامل کیا جائے، اس سے طلبہ کی دینی تعلیم تو یقیناً مضبوط ہو گی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید دنیا کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو سکیں گے۔ ایسے تعلیم یافتہ علما سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا کے نتیجے میں پیدا شدہ دینی مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں بہتر طور پر کر سکیں گے۔ اسلام ہمیں علم اور ٹیکنالوجی کے حصول کی ترغیب دیتا ہے بشرطیکہ اسے اللہ کی رضا کے لیے استعمال کیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی آگے بڑھیں تاکہ ہم دوبارہ علم وفن کے میدان میں سرخیل بن سکیں۔

مصنوعی ذہانت کا صحت کے شعبے میں کردار

مصنوعی ذہانت صحت کے شعبے میں ایک نئی امید بن کر ابھری ہے، صحت ہماری زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ہے لیکن نت نئی بیماریاں ہمیں کسی وقت بھی لاحق ہوسکتی ہیں۔ خوش قسمتی سے AI اب صحت کے شعبے میں انتہائی مثبت تبدیلی لا رہی ہے اور یہ ہمیں تندرستی کے حصول اور بیماریوں سے تحفظ فراہم کرنے میں مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے۔ بیماری کی صحیح تشخیص علاج کی طرف پہلا اہم قدم ہے۔ بعض اوقات ڈاکٹروں کیلئے پیچیدہ علامات کی بنا پر درست تشخیص کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن AI مختلف طبی آلات مثلاً ایکسرے، MRI اور CT سکین کا تجزیہ کرکے بیماریوں کی درست اور تیز تر تشخیص میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے علاج میں تاخیر سے بچاؤ ممکن ہو جاتا ہے جو صحت کے لیے بہتر نتائج کا باعث بنتا ہے۔ ہر مریض منفرد ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی اسی طرح ذاتی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ مصنوعی ذہانت طبی ریکارڈ، جینیاتی معلومات اور دیگر عوامل کا تجزیہ کرکے انفرادی مریضوں کیلئے بہترین علاج کی منصوبہ بندی میں معاون ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے یکساں طریقِ علاج یعنی One size fits all کے برعکس زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نئی ادویات کی دریافت ایک طویل اور مہنگا عمل ہے لیکن مصنوعی ذہانت اس عمل کو تیز اور زیادہ مؤثر بنانے میں مدد کر رہی ہے۔

ذہنی صحت ہماری مجموعی صحت کا ایک اہم جزو ہے، AI ذہنی صحت کے مسائل مثلاً ذہنی دباؤ اور اضطراب کی تشخیص و علاج میں مدد کرسکتی ہے۔ AI چیٹ باٹس کے ذریعے مریضوں کو مشورہ فراہم کرسکتی ہے اور انہیں ذہنی صحت کے ماہرین سے رابطہ کرنے میں مددگار بن سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے طبی امداد تک رسائی آسان بنا رہی ہے۔ یہ ٹیلی میڈیسن کے ذریعے مریضوں کو دیہات اور چھوٹے شہروں میں رہتے ہوئے بھی ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کی سہولت فراہم کر رہی ہے، اس سے وقت اور پیسے کی بچت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بروقت طبی امداد مل سکتی ہے۔ AI سرجری میں بھی انقلاب برپا کر رہی ہے اور روبوٹک سرجری میں معاون ہے، جس سے سرجن کو انتہائی پیچیدہ اور کم سے کم غلطی والی سرجری کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سے مریضوں کی صحت یابی کا عمل تیز اور زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ بیمار افراد کی دیکھ بھال ایک اہم چیلنج ہے، مصنوعی ذہانت بیماروں کی دیکھ

بھال میں مددگار ثابت ہورہی ہے۔AI سینسرز کے ذریعے مریضوں کی صحت کی نگرانی کرسکتی ہےاور کسی بھی تبدیلی کی صورت میں خبردار کرسکتی ہے،اس سے بروقت طبی مداخلت ممکن ہوجاتی ہے یہ صحت کے اخراجات کوکم کرنے میں معاون ہے۔اس کے علاوہ یہ ڈاکٹروں کا وقت بچا سکتی ہےاوراس سے صحت کی دیکھ بھال زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ حصول ہوتی ہے۔

تعلیم کے روشن مستقبل میں مصنوعی ذہانت کا کردار

تعلیم وہ ذریعہ ہے جوہمیں ترقی کرنے اور اپنی صلاحیتوں کونکھارنے میں مدد دیتا ہےلیکن بدلتے ہوئے دور میں، روایتی تعلیمی نظام کومحدودیت کا سامنا ہے۔کلاسوں کا بڑا سائز،انفرادی توجہ کی کمی اور سیکھنے کے یکساں طریقے طلبہ کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ہورہے ہیں۔خوش قسمتی سے AI نےتعلیم کے شعبے میں امید کی ایک نئی شمع جلائی ہے۔یہ ہمیں ایک زیادہ موثر،شخصی نوعیت کا اور سیکھنے کا دلچسپ تجربہ فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہورہی ہے۔ہرطالبعلم منفرد ہےاوراس کا سیکھنے کا انداز بھی منفرد ہوسکتا ہے۔AI ہرطالبعلم کیلئے سیکھنے کا انفرادی ماحول تشکیل دے سکتی ہے۔یہ طالبعلم کی رفتار، کمزوریوں اور طاقتوں کا تجزیہ کرکے ان کے لیے سیکھنے کا ایسا منصوبہ تیار کرسکتی ہے جواُس کے انفرادی تقاضوں کے مطابق ہو،اس سے ہرطالبعلم اپنی رفتار سے سیکھ سکتا ہےاور زیادہ مؤثر انداز میں مضامین کوسمجھ سکتا ہے۔AI کلاس روم کی بوریت کو دور کرکے تعلیم کو دلچسپ اور پُرکشش بنانے میں مددگار ثابت ہورہی ہے۔یہ گیمز،عکسی تصاویراور انٹرایکٹوسرگرمیوں کے ذریعے طلبہ کوسیکھنے میں مصروف رکھتی ہے' وہ سیکھنے کے عمل سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور معلومات کوبہتر طور پر یاد رکھتے ہیں۔

روایتی تعلیمی نظام میں سیکھنے کا عمل کلاس روم تک ہی محدود رہتا ہےلیکن AI سیکھنے کا ایک کل وقتی عمل ہے۔AI ایپس اورآن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے طلبہ کسی بھی وقت، کہیں سے بھی سیکھ سکتے ہیں، یہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہے جوسکول کے بعد مزید پریکٹس کرنا چاہتے ہیں یا کسی خاص موضوع کو دوبارہ سمجھنا چاہتے ہیں۔AI طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی مدد کا بھی ایک ذریعہ ہے، یہ اساتذہ کے لیے طلبہ کی کارکردگی کا تجزیہ کرنے، ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنے اوران کی مدد کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنے میں معاون ہے،اس سے

اساتذہ اپنا قیمتی وقت انفرادی توجہ اور رہنمائی فراہم کرنے میں لگا سکتے ہیں۔ دنیا مسلسل ترقی کر رہی ہے اور نئی چیزیں سیکھنا ضروری ہے۔ مصنوعی ذہانت نئے سیکھنے کے مواقع پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ یہ آن لائن نصابوں اور ورکشاپس کے ذریعے لوگوں کی صلاحیت بڑھانے اور پیشہ ورانہ زندگی میں ترقی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس سے علم تک رسائی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ AI دور دراز علاقوں میں رہنے والے طلبہ کو بھی سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ تاہم اس کا ذمہ داری سے استعمال ضروری ہے اور یہ بھی کہ یہ ٹیکنالوجی اساتذہ کی جگہ نہ لے، بلکہ ان کی مددگار ثابت ہو۔ اس کے علاوہ، ڈیجیٹل تقسیم کو کم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر طالبعلم کو AI کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔ مجموعی طور پر AI تعلیم کے مستقبل کو روشن بنا رہی ہے اور ہمیں ایک ایسا تعلیمی نظام فراہم کر رہی ہے جو ہر طالبعلم کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں معاون ہے۔ یہ نئی ٹیکنالوجی مستقبل کی نسل کو علم و ہنر سے آراستہ کرنے اور ایک بہتر دنیا کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرے گی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مصنوعی ذہانت خیر ہے، مگر خیرِ کُل نہیں ہے۔ جہاں اس کے بیشمار فوائد ہیں وہاں اس کے ممکنہ مفاسد بھی کم نہیں ہیں۔ الغرض یہ دو دھاری تلوار ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد معظم فراز سیفی نے دینی' تہذیبی اور اخلاقی پہلوؤں کی اہمیت پر زور دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کام مصنوعی ذہانت کے روبوٹ یا مشینیں نہیں کریں گی بلکہ یہ اُن انسانوں کی ذمہ داری ہے جو اس ٹیکنالوجی کو استعمال کریں گے۔ آج امریکہ سمیت تمام حکومتوں کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر اگر کوئی تحدید و توازن کا نظام قائم کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا کیونکہ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور موبائل انسانوں کی زندگی کا لازمی حصہ بنتے جا رہے ہیں اور ان کی زَد سے بچنا آسان نہیں ہے۔ اگر حکومت پابندی لگاتی ہے تو اظہارِ رائے اور پریس کی آزادی کی ''تقدیس'' کے نام پر اتنا واویلا مچایا جاتا ہے کہ حکومتیں اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتیں، نیز عدالتیں بھی فیشن کے طور پر لبرل ہو چکی ہیں۔ جج صاحبان ایسے مقبولِ عام فیصلے کرنے لگے ہیں جو سوشل میڈیا اور ٹی وی سکرینوں کی زینت بنیں۔ ایسی فضا میں ملک و ملت کا عظیم تر مفاد آئین و قانون کی بالادستی' ملکی وحدت و سلامتی اور دینی و اخلاقی اقدار کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس

بات سے ہمیں اتفاق ہے: اعلیٰ ماہرین کیلئے تو AI کی آمد سے یقیناً مواقع پیدا ہوں گے، لیکن جب سب یا اکثر کام روبوٹ اور مشینیں کریں گی تو بڑے پیمانے پر لوگ بیروزگار ہوں گے۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے۔ ہم نے اپنے ایک سابقہ کالم میں بیروزگاری کے اسی سیلاب کے مابعد اثرات پر گفتگو کی تھی۔ اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوں گے اُن کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔

سنا ہے کہ حکومت اور اداروں نے سوشل میڈیا پر تحدید وتوازن کے لیے چین سے Firewall ٹیکنالوجی کے حصول کا فیصلہ کیا ہے۔ بعض وی لاگرز نے بتایا ہے کہ بس چند دن کی بات ہے، سب کا ناطقہ بند ہو جائے گا۔ لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہے کہ سوشل میڈیا سے جو شعلے بلند ہو رہے ہیں، ان کا ازالہ کیسے کیا جائے گا؟ کیا کروڑوں لوگوں کی پوسٹوں کے ردّوقبول کا فیصلہ مشینیں کریں گی؟ ہم چونکہ نان ٹیکنیکل لوگ ہیں' اس لیے ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ حکمرانوں کے لیے تو پریشانی کی بات یہ ہے کہ مقتدر اداروں اور شخصیتوں کی اہانت کا سلسلہ بند ہو۔[1] ہمارے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر اللہ تبارک وتعالیٰ، رسالت مآب ﷺ، قرآنِ کریم اور دینی مقدّسات کی حرمتوں کی پامالی برملا ہو رہی ہے، اس کی کسی کو پروا نہیں ہے۔ جنرل یا جج کی توہین ہو جائے تو تہلکہ مچ جائے گا، جج کے پاس توہینِ عدالت کا اختیار ہر وقت رہتا ہے لیکن ان دینی مقدسات کی حرمتوں کی حکومت، پارلیمنٹ، مقتدرہ اور عدلیہ کو کوئی پروا نہیں ہے۔ اس ملک میں توہینِ عدالت تو ازخود لگ سکتی ہے' بلکہ پیشگی وارننگ دے دی جاتی ہے، لیکن دینی مقدسات کی توہین پر کبھی ازخود نوٹس نہیں لیا گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی باگ ڈور سرمایہ دار کے پاس ہے، وہی سائنسدانوں کے جوہرِ قابل کا خریدار، استعمال کنندہ اور فروخت کنندہ ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات پر اربوں ڈالر خرچ کرتا ہے، اُسے اپنا برانڈ بنا کر رجسٹرڈ کرتا ہے اور پھر من پسند قیمت وصول کرتا ہے، یہ استحصال کا ایک مہذب طریقہ ہے۔ سرمایہ دار کا دینی، تہذیبی، اخلاقی اور سماجی اقدار سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، سرمائے کی سرشت میں استحصال، خودغرضی اور سنگدلی ہے، یہ ہم عمومی بات کر رہے ہیں، مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں۔

---

[1] یہ فائر وال آ چکی ہے اور اس نے کوئی انقلاب برپا نہیں کیا سوائے چند حکومت مخالف یوٹیوبرز کی گرفتاری کے اور انٹرنیٹ کی رفتار کم کرنے کے جس نے ملکی معیشت کو دھچکا پہنچایا ہے۔

تفہیم دین

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

نظمِ اجتماعی میں عورتوں کی شمولیت

اسلامی امارت افغانستان نے عورتوں کے حقوق کی جو تشریح کی ہے اس کی حکمت اسلامی حلقوں میں بھی واضح نہیں۔ بالخصوص خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ضمن میں جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کے بارے میں اسلامی حلقوں میں بھی شکوک کا اظہار کیا جارہا ہے۔اس رویہ کو اختیار کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نجی زندگی (پرائیویٹ لائف) اور نظم اجتماعی (پبلک آرڈر) کے تعلق کو دورِ حاضر کے تناظر میں پوری طرح نہیں سمجھے۔

اس مضمون کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں نجی زندگی اور نظمِ اجتماعی کے اسلامی تصور پر تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر نجی زندگی اور نظم اجتماعی کی سرمایہ دارانہ تشکیل زیر بحث لائی جائے گی اور آخر میں اس ضمن میں سامراجی تخریب کاری اور دراندازی کی اجمالی تشریح پیش کی جائے گی۔

نجی زندگی اور نظمِ اجتماعی

امارتِ اسلامی نے عورتوں کے حقوق کی جو تشریح حضرت امیر المومنین کے جاری کردہ فرمان (مجریہ 2022ء) کے مطابق کی ہے وہ شرع مطہرہ اور ہماری چودہ سو سالہ تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے۔اس چودہ سو سالہ تاریخ میں کبھی بھی عورتوں کو نظم اجتماعی کے دائرہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ نہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا اور نہ ان کو عدلیہ، انتظامیہ اور افواج میں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ نہ ثقافتی میدانوں میں وہ منظر عام پر لائی گئیں۔

عورتوں کو نظم اجتماعی میں شامل کرنا لازماً تاریخ اسلامی کے اصل اور مرکزی دھارے سے انحراف ہے۔ اسلام عورتوں کا دائرہ کار نجی زندگی تک محدود کرتا ہے اور ان کو نظم اجتماعی (حصولِ رزق، عدل کی فراہمی، جہاد وغیرہ) کی ذمہ داریاں نہیں سونپتا۔ نجی زندگی اسلامی روحانیت اور اخلاقیات کی تعمیر اور فروغ کا اصل دائرہ ہے اور پرورشِ اطفال اور خانگی تحکم کے ذریعہ عورتیں اسلامی کردار اور شخصیت کی اصل معمار ہوتی ہیں۔ وہ گھر کی ملکہ ہوتی ہیں اور عفت

و پاکیزگی ان کی بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ اسلامی گھرانے اسلامی تہذیبی مراکز ہوتے ہیں جہاں اسلامی ثقافت اور فنون فروغ پاتے ہیں۔نسوانیت کا اصل اظہار (بے غرضی، خلوص، محبت، اخلاص) کا فطری دائرۂ اظہار نجی زندگی ہی ہے۔

نظمِ اجتماعی کی ذمہ داریاں اگر عورتوں کو سونپی جائیں تو نسوانیت تباہ ہو جاتی ہے اور نسوانیت کی تباہی اور اسلامی معاشرت کا انہدام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اخلاص، محبت، بے غرضی اور ایثار کے فطری سوتے سوکھ جاتے ہیں۔عفت وعصمت لایعنی تصورات بن جاتے ہیں۔ اطفال کی تربیت سازی کا عمل اور بزرگوں کی خدمت کا عمل معدوم ہوتا چلا جاتا ہے۔نجی زندگی کا دائرہ سکڑ کر نظم اجتماعی کا ذیلی شعبہ بن جاتا ہے۔ خاندان بالخصوص قبائلی نظاماتی خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔عورتوں کو نظم اجتماعی کی ذمہ داریوں سے بری رکھنا ان کی نسوانیت اور نجی زندگی کے دائرہ کار کے تحفظ کے لیے لازمی ہے۔

اس بات کا احساس صرف ہمیں نہیں عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی تھا۔ انہوں نے بھی اٹھارھویں صدی تک عورتوں کو نظم اجتماعی کے دائرہ کار سے باہر رکھا۔ان کے ہاں بھی خاندانی نظام کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ان کے ہاں بھی عفت وعصمت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں بھی پرورشِ اطفال اور خدمتِ بزرگاں عورتوں کی بنیادی ذمہ داری تصور کی جاتی تھی۔ان کے ہاں بھی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی فراہمی اور عورتوں کو انتظامی ذمہ داریاں سونپنے کا کوئی رواج نہ تھا۔عورتوں کی ذمہ داریوں کو نجی دائرہ کار تک محدود رکھنا ابراہیمی مذاہب کی مشترکہ روایت ہے۔

سرمایہ دارانہ نسوانیت کشی

سرمایہ داری کا نسوانیت پر حملہ اس کی عیسائیت دشمنی کا ایک جزو ہے۔سرمایہ حرص وہوس کی تجسیم ہے جو دولت اور محنت پر قبضہ کر کے معاشرت کو پراگندہ کرتا رہتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں نجی زندگی اور نظم اجتماعی میں تقسیم مبہم ہوتی چلی جاتی ہے۔سرمایہ صرف ریاست اور مارکیٹ پر قبضہ نہیں کرتا اس کا اصل ہدف حرص اور ہوس سے مغلوب سرمایہ دارانہ انفرادیت کی پرورش ہوتی ہے۔

سرمایہ کا تحکم نجی زندگی پر مسلط کرنے کے لیے نسوانیت کی تباہی ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نسوانیت کو دو طریقوں سے برباد کیا جاتا ہے۔ ایک طرف عورتوں کی ملازمت کو فروغ دے کر ان کو سرمایہ کے گردشی چکر کا اسیر بنایا جاتا ہے۔ ان پر حصولِ معاش کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ وہ سرمایہ کی غلام بنا دی جاتی ہیں اور یوں ان میں خودغرضی، لالچ اور حسد کی پرورش کر کے ان کی فطری بے غرضی اور ایثار کی صفات کو کچلا جاتا ہے۔ اس عمل نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے زور پکڑا اور اب یورپ اور امریکا کی ہر عورت اپنی نسوانیت کو ترک کر کے سرمایہ کی غلام بن گئی ہے اور یہ عمل بھارت اور چین میں بھی پورے زور وشور سے جاری ہے۔

دوسری طرف عورت کے جسم کی سرمایہ کاری کا فروغ جاری ہے۔ اشتہارات کی صنعت، تفریحی صنعتیں اور میڈیا عورت کے جسم کی فروخت کے ذریعہ نسوانیت کو تباہ کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں معاشرہ فحاشی کے سیلاب میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ زنا ایک وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ خاندانی نظام برباد ہو گیا ہے۔ نفسیاتی اور جنسی امراض پھیل رہے ہیں۔ پوپ فرانسس اغلام بازوں کا وکیل بن گیا ہے۔ شرح افزائش آبادی منفی ہو رہی ہے اور اقوام متحدہ زنا بالرضا کو ہیومن رائٹ قرار دے رہی ہے۔ بے غیرت عیسائی، یہودی اور مسلمان یہ سب برداشت کر رہے ہیں اور ردِنسوانیت (Feminism) کی اس مہم کو مسلم دنیا میں پھیلانے کی راہ ہموار کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

ردِنسوانیت کی سامراجی مہم

ہم امارت اسلامیہ افغانستان میں ایک غیر سرمایہ دارانہ معیشت اور معاشرت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں نسوانیت کا تحفظ لازم ہے کیونکہ یہ کیے بغیر قومی معاشرت کو غیر سرمایہ دارانہ اور اسلامی خطوط پر استوار نہیں کیا جا سکتا اور ہم اسلامی امارتی نظام کو تاریخ اسلامی کا تسلسل نہیں بنا سکتے۔

آج سامراج (اقوام متحدہ، ورلڈ بینک اور نیٹو سے منسلک ہیومینٹرین گروپ) افغانستان میں تردیدِنسوانیت کی تحریک کو فروغ دینے کی بھرپور مہم چلائے ہوئے ہیں۔ وہ عورتوں پر نظم اجتماعی کی ذمہ داریاں تھوپنے کی وکالت کر رہے ہیں۔ وہ ہم سے مطالبہ کر رہے

ہیں کہ عورتوں کے سرمایہ دارانہ حقوق بحال کیے جائیں۔عورتوں کی سرمایہ دارانہ غلامی کو فروغ دیا جائے۔حجاب اور سفر میں محرم کی شمولیت کے احکام منسوخ کیے جائیں اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم میں شمولیت کو بحال کیا جائے جب کہ مروجہ نظام تعلیم میں نسوانیت کی صفات کے فروغ کا کوئی تصور موجود نہیں اور ہماری تاریخ میں یہ بالکل اجنبی تصور ہے۔

اس سامراجی مہم کا مقصد عورتوں کو قبائلی خاندانی نظام کے تحفظ سے محروم کرنا ہے اور افغان معاشرت کو سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب کرنا ہے تا کہ اسلامی اقدار کی معاشرتی بنیادیں کمزور ہوں اور سرمایہ دارانہ عمل نجی زندگی کے دائرہ کو اپنے اندر سمو لے۔عورتیں اپنی نسوانیت کھوتی چلی جائیں۔ وہ سرمایہ دارانہ گردشی چکر میں گرفتار ہوں۔حرص اور ہوس کا معاشرتی پھیلاؤ ہو۔افغان اسلامی شعور اور ثقافتی نظام تباہ ہو۔فحاشی اور بدکاری عام ہو۔افغانستان عالمی سرمایہ دارانہ معاشی اور معاشرتی نظام میں ضم ہوتا چلا جائے۔ اور اسلامی حکومت (جس کو سامراج کے تمام نمائندہ ادارے وقتی کہتے ہیں) بالآخر ختم ہو جائے اور سرمایہ دارانہ سیکولر سامراج کے غلام دوبارہ ریاستی اقتدار سنبھالیں۔

ہمیں سامراجی مطالبات کو مطلقاً مسترد کر دینا چاہیے کیونکہ اس قسم کے مطالبات کے جزوی اجراء کے ہولناک نتائج ہم اسلامی جمہوریہ ایران میں دیکھ رہے ہیں جہاں لبرل اور قوم پرست قوتوں کے دباؤ کے نتیجہ میں اسلامی حکومت نے خواتین کے سرمایہ دارانہ حقوق تعلیم اور ملازمت اور مواصلت کے ضمن میں قبول کر لیے۔اس کے نتیجہ میں تحریک ردِنسوانیت یعنی فیمی نزم آج ایران میں سب سے طاقت ور اسلام مخالف رجحان کے طور پر منظم ہے اور معاشرہ میں فحاشی اور زنا کاری عام ہو رہی ہے۔ ایرانی ادب اور ثقافت میں بھی اشتراکی اور انارکسٹ رجحانات عام ہیں۔

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ہم سرمایہ داری سے مفاہمت یا سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح نہیں چاہتے۔ہم اس کے انہدام کی جدوجہد کر رہے ہیں۔تحفظ نسوانیت یعنی نسوانیت کے سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی میں انضمام سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔سامراج کی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود ہم اس فرض کو ادا کرتے رہیں گے،ان شاءاللہ۔

تفہیم دین

محمد بلال

حق اور علمائے عزیمت

دین اپنی اصل میں ہمیشہ سے اصحاب عزیمت ہی کی بدولت قائم ودائم رہا نہ کہ اصحاب رخصت کے باعث۔ بطور دلیل حضرت عمر بن خطابؓ سے لے کر ملا عمرؒ تک، امام ابوحنیفہؒ سے خاندانِ شاہ ولی اللہ اور موجودہ علمائے حق تک، امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر امام محمد بن عبدالوہابؒ اور موجودہ علمائے عقائد تک اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے لے کر ممتاز قادریؒ وعصرِ حاضر تک کے غازیان کی تاریخ کا سرسری جائزہ ان دعاوی کے ثبوت کے لیے کافی وشافی ہو گا۔ اصحابِ عزیمت ہر دور میں پائے جاتے ہیں، ہمیں بس انہیں پہچان کر ان کی اتباع کرنی چاہیے تا کہ دنیا وآخرت میں اللہ کے حضور اس کی رحمت کے سائے میں قابلِ قبول بن سکیں۔ اسی طرح ہر دور میں ان کے مخالف بھی بہت سے گروہ موجود ہوتے ہیں (مسلم وغیر مسلم دونوں) ان کی پہچان بھی بہت ضروری ہے تا کہ ہم ان کے فتنے سے بچ سکیں اور نادانستگی میں ان کے فہمِ اسلام کے مطابق ان کا ساتھ دینے کی سنگین غلطی نہ کر بیٹھیں۔ اللہ ہمارے دلوں میں حق کی طلب پیدا کرے اور ہمیں علمائے حق کی پہچان، صحبت اور اتباع نصیب فرمائے۔ آمین

بقیہ: امریکا میں صہیونی لابی کا کردار

صہیونی لابی کی قوت اس کی امریکی سیاسی نظام میں پیوستگی سے برآمد ہوتی ہے۔ وہ لاکھوں مظاہرین جو غزہ کی دہشت گردی کے خلاف امریکا میں مظاہرے کر رہے ہیں اور ان میں یہودی Jewish Voice for Peace بھی شامل ہے، بے اختیار اور بے بس ہیں۔ انہیں امریکی جمہوری نظام بے بس اور بے اختیار رکھتا ہے۔ جمہوری عمل کے نتیجہ میں بہیمانہ نسل کشی کو ایک فطری عمل کے طور پر باور کروایا گیا ہے بالکل جیسے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ریڈ انڈینوں کی نسل کشی کو نارملائز کیا گیا تھا۔ امریکی عوام کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ مسلمان ہیومن بی اِنگ نہیں جانور ہیں اور آج ان کا قتل عام اور بے دخلی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ریڈ انڈینز کی کُل تھی۔ امریکی عوام جمہوریت کے قیدی ہیں۔ وہ اس قتل عام اور دہشت گردی کو روکنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس قتلِ عام کو شکست دینے کا واحد ذریعہ وہ جہاد ہے جو حماس اور حزب اللہ نے جاری رکھا ہوا ہے۔

تبصرۂ کتب و جرائد مدیر

ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۲۴ء

کے علمی مذاکرہ 'اسلامی احیاء' پر تبصرہ (آخری قسط)

مدیر: پروفیسر خورشید احمد نائب مدیر: پروفیسر سلیم منصور خالد

ہم نے البرہان کے اکتوبر ۲۰۲۴ء کے شمارے میں ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن کے شمارہ جولائی واگست ۲۰۲۴ء میں 'اسلامی احیاء' کے موضوع پر شائع ہونے والے مذاکرہ کے اہم مضامین پر تبصرہ کیا تھا اور ہمیں توقع نہیں تھی کہ اس موضوع پر ہمیں دوبارہ قلم اٹھانا پڑے گا لیکن ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۲۴ء میں بعض ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جو ہماری رائے میں ایک غلط رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ہمیں اس موضوع پر دوبارہ قلم اٹھانا پڑا۔

ڈاکٹر بلال مسعود کا مؤقف

ڈاکٹر بلال مسعود صاحب کا مؤقف سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں رکھیے کہ اسلامی فلسفۂ علم (Epistemology) کی رو سے علوم کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ علوم نقلیہ: یعنی قرآن وسنت جو سارے علوم کا مآخذ اور معیار ہیں۔ جو بات ان کے مطابق ہو وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہوتی ہے اور جو ان کے خلاف ہو، مسلمان اسے ردّ کرنے کے مکلف ہیں۔

۲۔ علوم آلیہ: جو علوم نقلیہ کے سمجھنے میں معاون ہیں جیسے اصول تفسیر، اصول حدیث، عربی زبان وادب وغیرہ۔

۳۔ سماجی علوم: جو بیک وقت علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں سے مستفاد ہوتے ہیں۔ ان کے بنیادی اصول قرآن وسنت میں موجود ہیں جن سے کوئی مسلمان عالم صَرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ تاہم ان علوم کی تفصیل میں اجتہادی عنصر لازمی ہوجاتا ہے کیونکہ ان کا جو حصہ قابل تغیر ہے وہ زمان ومکان کی تبدیلی سے بدلتا رہتا ہے اور اسے بدلتے رہنا چاہیے لیکن اس کے لیے جس آزادی اور جس تحقیق کی ضرورت ہے اسے دینی روایت میں اجتہاد کہتے ہیں یعنی سماجی وعمرانی علوم کی فروعات میں جو تبدیلیاں درکار ہیں وہ قرآن وسنت کی تعلیمات ومقاصد کے مطابق

ہونی چاہئیں ورنہ وہ قابل ردّ ٹھہریں گی۔ یہ وہ انتہائی ضروری کام ہے جو مسلم اہل علم نہیں کررہے اور مغرب سے آنے والے الحادی عمرانی علوم کو قبول کرتے جارہے ہیں۔

۴۔ خالص عقلی علوم: جیسے ریاضی، سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ۔ جن میں دینی وشرعی رہنمائی کی ضرورت بظاہر محسوس نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر بلال مسعود صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ مسلمان اس لیے پیچھے رہ گئے ہیں کہ وہ ان عقلی علوم میں پیچھے رہ گئے ہیں جن میں شرعی رہنمائی کا زیادہ دخل ہی نہیں۔ اس لیے قرآن وسنت پر عمل کرنے کا مطالبہ کرنے کی بجائے ہمیں ان عقلی ودنیاوی علوم میں آگے نکلنے پر ترکیز کرنی چاہیے کیونکہ مغرب ان علوم وفنون میں ترقی کرنے کی وجہ سے ہی دنیا پر اور مسلمانوں پر غالب ہے اور مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی وجہ سائنس وٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانا ہے۔ بظاہر اس بات میں وزن محسوس ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر بلال مسعود صاحب اور ان کی طرز پر سوچنے والے دیگر حضرات (خود ڈاکٹر صاحب نے ترجمان القرآن کے شمارہ اگست ۲۰۲۴ء میں اس موضوع پر شائع ہونے والے سید سردار علی صاحب کے نقطۂ نظر کو ہی آگے بڑھایا ہے (جس پر ہماری تنقید البرہان کے شمارہ اکتوبر ۲۰۲۴ء میں موجود ہے) یہ رائے قائم کرتے ہوئے وہ چند اہم باتیں بھول جاتے ہیں:

ایک: یہ کہ انسانی شخصیت کی تعمیر واصلاح میں بنیادی کردار وحیٔ الٰہی کا ہے یعنی ان الٰہی ہدایات کا جو ہمارا خالق ومالک وربّ ومعبود وہادی پیغمبروں کے ذریعے ہم انسانوں تک پہنچاتا ہے اور ان تعلیمات پر عمل کا داعیہ اور صلاحیت ہمارے اندر پیدا کرتا ہے۔ قرآن اوّل الذکر کو تعلیم، دعوت، تبلیغ اور ثانی الذکر کو تزکیۂ نفس سے تعبیر کرتا ہے۔ اس امر کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ قرآن حکیم نے جتنے انبیاء کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا ہے ان کی تعلیم ودعوت وتبلیغ کا یہی مقصد بتایا ہے۔ اور تعلیم وتزکیہ دونوں کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قرآن حکیم میں چار دفعہ فرمایا ہے[۱] اور ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ کہتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ پہلے انبیاء کے صحیفوں (خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں) ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴾[۲] میں بھی

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲، ۲

[۲] الاعلیٰ ۸۷: ۱۸، ۱۹

یہی فرمایا گیا تھا۔

دوسرے: قرآن وسنت بلاشبہ ہمارے دین کا،تعلیم وتزکیہ کا اور سارے علوم کا مآخذ ہیں (علوم عقلیہ کے مباح ہونے کی اجازت بھی قرآن وسنت ہی نے ہمیں دی ہے) لیکن ان کے بعد مسلم معاشرے اور مسلم تہذیب کا دارومدار سماجی علوم کے ارتقا پر ہے کیونکہ انسانی معاشرت،معیشت،سیاست،تعلیم،عدالت وغیرہ تغیر پذیر ہیں لہٰذا جب تک اس تغیر پذیر حصے (Segment) کا ارتقاء نصوص قرآن وسنت اور ان کے مقاصد کی روشنی میں نہ ہو، اسلامی شخصیت صحیح رُخ پر پروان نہیں چڑھ سکتی اور نہ اسلامی معاشرہ، اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب صحیح خطوط پر ڈویلپ ہوسکتی ہے۔اس لیے سماجی وعمرانی علوم کا اسلامی تناظر میں ارتقا اسلامی شخصیت کی تعمیر اور اسلامی تہذیب کی نموء میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور علوم نقلیہ کے بعد عمرانی علوم کی اسلامی تناظر میں تشکیل وارتقاء انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

تیسرے: وحی کے اسلوب میں یہ اللہ تعالیٰ کی زبردست حکمت ہے کہ اس نے ان اہم امور کو جن پر فرد اور معاشرے کی بنیاد ہے اور جن کے بغیر فرد اور معاشرہ صحیح خطوط پر استوار نہیں ہوسکتا، انہیں قرآن میں تفصیل سے بیان کردیا ہے جیسے عقائد،عبادات اور اخلاق۔ان شعبوں میں چونکہ تغیر کی ضرورت نہیں بلکہ ثبات کی ضرورت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان شعبوں میں ناقابل تغیر تفصیلی احکام عطا فرمائے۔عمرانی علوم میں چونکہ تغیر کی ضرورت تھی۔اس لیے وہاں شارع نے اصولی بنیادیں عطا فرما کر انہیں ناقابل تغیر قرار دے دیا۔تاہم ان کی تفصیلات کو، جنہیں زمان ومکان کی تبدیلی کی وجہ سے تغیر کی ضرورت تھی،انہیں امت (کے اہل علم) پر چھوڑ دیا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرکے ان میں نئی تفصیلات وضع کرلیں۔گویا عمرانی علوم بیک وقت نقلی بھی ہیں اور عقلی بھی۔

تاہم جو امور خالص عقلی ہیں ان میں تغیر کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے اور وہ اتنے اہم بھی نہیں کہ ان کے بغیر آدمی ہدایت نہ پاسکے یا ہدایت کے راستے پر نہ چل سکے،لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی عقل پر چھوڑ دیا تاکہ انسان اپنی عقل وتجربے سے اس میں تبدیلیاں کرتے رہیں جیسے ریاضی،سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ میں۔

لیکن اس کے باوجود انہیں اسلامی تناظر میں پیش کرنا اور اسلامی مقاصد کو پیش نظر رکھتے

ہوئے استعمال کرنا ضروری ہے۔ جیسے ریاضی میں سوالات سود کی بجائے زکوٰۃ وعشر سے متعلق دینا اور سائنس وٹیکنالوجی میں ایسی ایجادات کرنا جن سے اخلاق کے بگڑنے کا امکان کم سے کم ہو۔ چنانچہ مسلم سائنسدانوں نے مسلم تہذیب کے عہد زریں میں جتنی بھی ایجادات کیں وہ کبھی اسلامی تہذیب کے لیے چیلنج اور فتنہ نہیں بنیں۔

جس ترتیب سے ہم نے اسلامی علوم کی اقسام بیان کی ہیں، اسی ترتیب کے لحاظ سے ان کی اہمیت ہے۔ سب سے اہم قرآن وسنت ہیں جو مسلم شخصیت کی بنیاد ہیں۔ اس کے بعد عمرانی علوم کی اہمیت ہے اور اس کے بعد عقلی علوم کی۔

چوتھے: یہ غلط فہمی ہمارے ہاں بہت سے اہل علم کو ہے کہ وہ سائنس وٹیکنالوجی کو 'بلا اقدار' (Value Neutral) سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ویلیو نیوٹرل نہیں ہیں۔ ہمارے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انٹرنیٹ، موبائل یا ٹی وی بری چیز نہیں۔ ان کا استعمال انہیں اچھا یا برا بناتا ہے۔ اگر ان کا استعمال برے مقاصد کے لیے کیا جائے تو یہ برے ہیں اور اگر ان کا استعمال اچھے مقاصد کے لیے کیا جائے تو یہ اچھے ہیں۔ یہ بات وہی لوگ کہتے ہیں جنہیں مغربی اہل علم کو پڑھنے اور جاننے کا موقعہ نہیں ملا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger) جیسے فلسفی سے لے کر سائمن رامو (Symon Ramo) جیسے سائنسدان تک اور لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford)، اینڈریو طاسکو (Andrew Tatusko)، نیل پوسٹ مین (Neil Postman)، جیکوئس ایلول (Jacques Ellul)، آئیوان ایلچ (Ivan Illich)، لانگڈن وِنر (Langdon Winner)، جوزف ویزن بام (Josseph Weizenbaum)، تھیوڈور روزاک (Theodore Roszak) جیسے مفکر اور دانشور یہ تسلیم کرتے ہیں اور اس پر سیکڑوں کتابیں اور تحقیقات مغرب میں شائع ہو چکی ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی Value-laden ہیں اور وہ اخلاق اور مذہب کی بیخ کنی کرتی ہیں۔ مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ کوئی مصنف لکھتے وقت اور کوئی موجد ایجاد کرتے وقت اس فکر وتہذیب سے لاتعلق نہیں ہوتا جس میں وہ رہ رہا ہوتا ہے اور جس نے اس کی فکر کی نمو اور شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیا ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آپ

ایسا کریں گے تو لازماً مسلم فکر وعمل پر اس کے برے اثرات پڑیں گے اور ہم انٹرنیٹ، ٹی وی اور موبائل کے مسلم فرد اور معاشرے پر برے اخلاقی اثرات کا مشاہدہ اپنی کھلی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت اپنے فلسفۂ علم اور اپنے فکری پیراڈائم میں رہتے ہوئے کریں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اسلامی علوم کو بھی مغرب کے تہذیبی غلبے کے اثرات بد سے بچائیں اور عمرانی علوم کی تشکیلِ نو اسلامی تناظر میں کریں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمرانی علوم ہوں یا سائنسی، ہم مغربی تہذیب سے اصولاً استفادہ کر سکتے ہیں کیونکہ کوئی تہذیب بھی ہوا بند کمروں میں پروان نہیں چڑھتی، نہ چڑھ سکتی ہے بلکہ لازماً وہ دوسری تہذیبوں سے کچھ نہ کچھ اخذ واستفادہ کرتی ہے۔ لیکن ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تب ممکن ہوتا ہے جب کوئی تہذیب اپنے پیروں پر کھڑی ہو، اپنے فیصلے خود کر سکتی ہو لیکن اِس وقت حقیقت یہ ہے، خواہ تلخ سہی، کہ ہم شکست خوردہ قوم اور تہذیب ہیں۔ ہمارے اہل علم اور ہمارے حکمرانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مغرب کی فکری غلام ہے۔ بقول اقبال ؎

دِل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارُو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

لہٰذا اس وقت "خذ ما صفا ودع ما کدر" کی بجائے "سدّ الذریعہ" کے اصول پر عمل کرنا پڑے گا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو اصولاً ردّ کریں اور اس کے محدود استفادے سے بھی بچنے کی شعوری کوشش کریں ورنہ فکری غلامی ہمیں مغرب کی عملی غلامی تک لے جا کر رہے گی جیسا کہ اِس وقت ہو رہا ہے۔

پانچویں: یہ بھی غلط العام ہے کہ مغرب کے دنیا پر غلبے کی وجہ سائنس وٹیکنالوجی ہے۔ اگر آپ قوموں کے عروج وزوال پر قرآن وسنت کی روشنی میں غور کریں تو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم کی دنیاوی ترقی کا انحصار اس تہذیب کے فرد کی اس کی بنیادی فکر/ عقائد سے وابستگی پر ہوتا ہے۔ نظریۂ حیات (چاہے غلط ہو یا صحیح) اس سے کمٹمنٹ ہی فرد کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرتی ہے جو اس کی دنیاوی ترقی پر منتج ہوتی ہیں۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

خلاصہ یہ کہ عقلی علوم میں ترقی اور سائنس وٹیکنالوجی میں برتری اہل مغرب کی ترقی کا حقیقی سبب نہیں بلکہ یہ اس کا مظہر ہے اور ان کی ترقی کا حقیقی سبب ان کی اپنے اصولِ حیات سے کمٹمنٹ ہے، فرد کی ان کے نظریۂ حیات کے مطابق تعمیر سیرت ہے جس کے نتیجے میں ان کی صلاحیتیں ان قوموں سے زیادہ ہیں جو اپنے نظریۂ حیات سے مخلص نہیں ہیں جس کی بدترین مثال ہم مسلمان ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو ہم سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ﴿ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [1] ''یعنی تمہی غالب رہو گے اگر تم (حقیقی) مومن ہو۔'' اور اللہ سے بڑھ کر سچا وعدہ کس کا ہوسکتا ہے؟

حاصل کلام یہ کہ ڈاکٹر بلال مسعود صاحب اور ان کے ہم خیال افراد کا یہ مؤقف درست نہیں ہے کہ اسلامی احیاء کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عقلی علوم اور دنیاوی علوم میں ترقی کریں تو دنیا کا مقابلہ کرسکیں گے اور ان سے آگے نکل جائیں گے۔ بلکہ ہماری ترقی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن وسنت سے ہماری گہری کمٹمنٹ ہو۔ ہم آگے بڑھنے کے لیے پیچھے لوٹیں یہاں تک کہ دورِ صحابہ تک جا پہنچیں جن کی قوت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے دو دہائیوں سے کم عرصے میں دو ورلڈ پاورز کو شکست دی جبکہ ان کے پاس ٹوٹی ہوئی تلواریں اور پچکے ہوئے پیٹوں والے گھوڑے ہوتے تھے۔ جب ہم یہ کرلیں گے تو دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی ۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گُلستاں پیدا

محمد عبدالشکور

انہوں نے علامہ یوسف القرضاوی مرحوم کی بات صحیح نوٹ کی کہ مسلم کثریتی علاقوں میں علم کی ترویج ہی اصل کام ہے، لیکن علم سے مراد مغرب کا علم نہیں ہے اور مسلم دنیا میں اشاعتِ علم کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم آکسفرڈ، کیمبرج، ہارورڈ اور ایم آئی ٹی جیسے تعلیمی ادارے اپنے ہاں قائم کریں۔ یاد رہے کہ ہمارے مرض کا علاج نہ علی گڑھ میں ہے نہ دیوبند میں۔ ہمیں علوم اور تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کرنا ہوگی۔ تعلیم سے مراد ہے تدریس، تحقیق اور تربیت۔ اس کے

[1] آل عمران ۳:۱۳۹

لیے ہمیں نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے قائم کرنا ہوں گے۔علی گڑھ نے ہمیں مغرب کا غلام بنادیا اور دینی مدارس نے ہمیں دنیاوی علوم سے کاٹ دیا۔ہمیں اس ثنویت کو ختم کرنا ہوگا۔ جدید تعلیم کے مغرب زدہ تعلیمی اداروں کو اکبرالہ آبادیؒ اور سید مودودیؒ نے بجا طور پر قتل گاہیں قرار دیا تھا اور مدارس کو جمود زدہ۔اگر ہمیں تعلیم کو مسلم نشأۃ ثانیہ، احیائے اسلام اور غلبۂ دین کا ذریعہ بنانا ہے تو ہمیں اسے انڈسٹری بنانے اور سمجھنے کی بجائے دعوت، تربیت، اصلاح، تزکیہ اور تحقیق کے مراکز بنانا ہوگا۔یقیناً سائنس اور ٹیکنالوجی بھی اس تعلیم کا حصہ ہوں گے۔لیکن اگر ہم نے اپنے تعلیمی اداروں کو محض کمرشل بنیادوں پر نفع اندوزی کے لیے چلانا ہے، وہاں آکسفرڈ کا سلیبس پڑھانا ہے۔انہیں انگلش میڈیم بنا کر مخلوط تعلیم دینا ہے۔بچوں کو ٹائی اور پینٹ کوٹ پہننا اور مسلمان لڑکیوں کو وی کی پٹی بنانا اور دوپٹہ گلے میں لٹکانا سکھانا ہے تو معاف کیجیے گا اس تعلیم سے 'اسلامی انقلاب' برآمد نہیں ہوسکتا۔

محمود شام

ان کی تجاویز بہت اچھی ہیں خصوصاً عالم اسلام کی سطح پر میڈیا اور تعلیم کے یکساں ادارے بنانے کی۔ہم بھی ایک عرصے سے اپنی تحریروں اور کتابوں میں یہ تجاویز دے رہے ہیں کہ پاکستان میں ایک نئی رول ماڈل غیر کمرشل یونیورسٹی بنائی جائے جو علی گڑھ اور دیوبند کی خوبیوں کو جمع کرے اور ان کی خامیوں سے پاک ہو۔یہ علوم اور نصابات کی اسلامی تشکیل نو کرے اور ثنویت سے پاک نئی نصابی کتب مدون کرے اور پاکستان اور عالم اسلام کی یونیورسٹیوں کو نصابی میٹریل مہیا کرے۔

مغربی قوتوں نے چونکہ مسلمانوں کے اتحاد کے سارے اداروں کو یرغمال بنا رکھا ہے اور وہ ریاستی سطح پر مسلم ممالک میں اتحاد نہیں ہونے دے رہیں اس لیے اس کام کی ابتداء بھی یونیورسٹی پروفیسرز اور اہل علم ودانش کسی یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے کرسکتے ہیں۔اس ادارے کو مسلم نشأۃ ثانیہ کے لیے تھنک ٹینک کا کام بھی کرنا چاہیے اور اس کام کو مختلف ممالک میں جاری رکھنا چاہیے تا آنکہ اللہ تعالیٰ مسلم حکمرانوں کو اس کا شعور بخشے اور یہ کام وہ خود اپنے ہاتھ میں لے کر قیادت کا حق ادا کریں۔وماذلك على الله بعزيز۔

al-Maktabtu’l Ilmia), 16.

18- Ignāz Goldziher (d. 1339/1921), Muslim Studies, Translated from German. C. R. Barbar and S. M.Stern. George Allen and Unwin Ltd, (London: Ruskin House Museum Street), 2: 17- 40.

19- Ignāz Goldziher, al- Aqīda ve-Sharia fi al-Islām, 13-19.

20- Schācht, Joseph (d. 1388/1969), The Origins of Muhammadan Jurisprudence, (London Oxford University Press, Ely House), 58.

21- Ghāmidī, Mīzān, 14.

22- Ignāz Goldziher, Muslim Studies, 2: 44-47.

23- Gautier Hendrik Albert Juynboll (1935-2010) was a prominent member of a well-known family of Orientalists in the Netherlands. Throughout his life, he dedicated himself to the study of hadith and authored numerous scholarly works on the subject.

Khan, Alam, Takyīmu Nazariyyāti Juynboll Havla al-hadis’n Nabavī),Trabzon: Kalam Yayinevi, 2019※(17–57.

24- Juynboll, G. H. A (d. 1431/2010), Muslim Tradition, (Sydney: Cambridge University Press, 1983), 148, 149, 158, 160.

25- az- Zahabī, Abū Abdillāh Muhammad b. Ahmad (d. 748/1347), Tazkirat al-Huffāz, (Beirut: Dār al-kutub al-Ilmi, 19981), 1: 83.

Union Theological Seminary in New York City. See for his detailed biography and approach to the Qurānic studies: Mesut, Okumuş, “Arthur Jeffery ve Kur' an Çalışmaları Üzerine”, Ankara Üniversitesi İlahiyat Fakültesi Dergisi. Cilt XLIII, (2002), Say 2 s.121-150.

15- `Umar b. al-Khattāb narrated that: I heard Hishām b. Hakim b. Hizām reciting Surat al-Furqān in a manner that differed from how I had been taught by Allah's Messenger. I was about to confront him during the prayer, but I chose to wait until he finished. Then, I grabbed his garment and brought him to Allah's Messenger, saying, "I have heard him reciting Surat al-Furqān differently than how you taught me." The Prophet ordered me to release him and asked Hishām to recite it. After he recited, Allah's Messenger affirmed, "It was revealed in this way." Then, he asked me to recite. When I recited, he again confirmed, "It was revealed in this way. The Qur'an has been revealed in seven different ways, so recite it in the way that is easier for you." Mamar b. Rāshid (d. 153/770), al- Jāmi, ed: Habib ur Rahman al- Azāmī, (Pakistan: al- Majlis al- Ilmī, 1403), 11: 218. al- Bukhārī, Abū Abdullāh Muhammad b. Ismāil (d. 256/870), Mukhtasr Sahīh al-Bukhārī, (KSA: Maktaba al- Maārif, 2002), 3: 335.

16- Ghāmidī, Mīzān, 30-31.

17- al-Rāmhurmuzī, Abū Mu□ammad al-□asan b. □Abd al-Ra□mān (d. 360/971), al-Muhadith al-Fāsil, ed: Dr. Muhammad Ajaj al-Khatib, (Beirut: Dār al-Fikar, 1404), 177. al-Hākim al-Nīshāburī , Abū Abdillāh Muhammad b. Abdillāh (d. 405/1014), Marifat ulūm al-Hadith, ed: Muazzam Hussain, (Beirut: Dār al-Kutub al-Ilmia, 1977), 17-21. al-Khatib al-Baghdādī, Abū Bakr Ahmad b. `Ali (d. 463/1071), al-Kifāya fi ilmi'r-Rivāya, ed: Abū Abdillah al-Suraqī, (KSA:

8- Joseph Schācht (1902–1969) was a British-German Orientalist and a leading scholar of Islamic jurisprudence in Europe. His extensive research and analysis significantly contributed to the understanding of Islamic legal traditions and their development. Abdur Rehman al-badavī, Mawsūatu'l Mustashriqīn, 252-253.

9- Schacht, Joseph, "Foreign Elements in Ancient Islamic Law." Journal of Comparative Legislation and International Law,

32(3/4), (1950), 9-17.

10- Ghāmidī, Mīzān, 48.

11- Theodor Nöldeke (1836 -1930)was a German orientalist and scholar. His research interests ranged over Old Testament studies, Semitic languages, and Arabic, Persian, and Syriac literature. Nöldeke translated several important works of oriental literature and during his lifetime, was considered an important orientalist. He wrote numerous studies (including on the Qur' ān) and contributed articles to the Encyclopædia Britannica. TDV İslâm Ansiklopedisi'nin (Istanbul, 2007), 33: 217-218

12- Noldeke, Theodor (d. 1348/1930), The History of the Qurān, ed: Friedrich Schwally, Gotthelf Bergsträßer, Otto Pretzl. Translated: Wolfgang H. Behn. (Boston: Brill, 2003), 389-532.

13- Ignāz Goldziher (d. 1339/1921), Mazāhib at-Tafsir al-Islāmī, Arabic: Abdul Halim an- Najār. (Egypt: Maktaba al-Khānjī, 1955), 7-16.

14- Arthur Jeffery (1892- 1959) was a Protestant Australian known for the Semitic languages he was Professor from 1921 at the School of Oriental Studies in Cairo, and from 1938 until his death jointly at Columbia University and

Schächt, Joseph, The Origins of Muhammadan Jurisprudence, London: Oxford University Press, Ely House. TDV İslâm Ansiklopedisi'nin Istanbul, 2007.

1- Jāved Ahmad Ghāmidī was born in 1951 near Sāhiwāl, Punjab, Pakistan. He pursued classical studies alongside Arabic and Persian within a traditional educational framework. He is the founder of the Al-Mawid Institute for Research and is recognized as a prominent scholar of the Farāhī-Islāhī school of thought in the Indo-Pak subcontinent. See: Ammar Baksh, "Javed Ahmad Ghāmidī: A Brief Introduction to his Life and Works", Date of access, 21 September 2019, http://almawridindia.org/Javed -Ahmad-Ghāmidī- a-brief-introduction-to-his-life-and-works/.

2- Ghāmidī, Javed Ahmad, Mīzān, (Lahore: al-Mawrid, Topical printing Press, 2014), 29-32.

3- Ghāmidī, Mīzān, 14-15.

4- Ghāmidī, Mīzān, 31.

5Ignāz Goldziher (1850–1921) was a Hungarian Jewish Orientalist renowned as the founder of Islamic studies in Europe. His pioneering work laid the foundation for modern scholarship on Islam, profoundly influencing the study of its texts and traditions. See for his detailed biography: Abdur Rehman al-badavī, Mawsūatu'l Mustashriqīn, (Beirut: Dār al-Ilam, 1993), 119-126.

6- Ignāz Goldziher (d. 1339/1921), al- Aqīda ve-Sharia fi al-Islām, Arabic translation: Muhammad Yūsūf Mūsā, Ali Hussain Abdul Qādir, Abdul Aziz, (Cairo al- Gabalaya St. Opera House, 2013), 12, 24, 26.

7- Ignāz Goldziher, al- Aqīda ve-Sharia fi al-Islām, 13, 19, 20, 24, 29.

Introduction to his Life and Works", Date of access, 21 September2019,http://almawridindia.org/Javed-Ahmad -Ghāmidī-a-brief-introduction-to-his-life-and-works/.

az- Zahabī, Abū Abdillāh Muhammad b. Ahmad, Tazkirat al-Huffāz, Beirut: Dār al-kutub al-Ilmia, 1998.

Ghāmidī, Javed Ahmad, Mīzān, Lahore: al-Mawrid, Topical printing Press, 2014.

Ignāz Goldziher, al- Aqīda ve-Sharia fi al-Islām, Arabic translation: Muhammad Yūsūf Mūsā, Ali Hussain Abdul Qādir, Abdul Aziz Abdul Haq. Cairo: al- Gabalaya St. Opera House. 2013.

Ignāz Goldziher, Mazāhib at-Tafsir al-Islāmī, Arabic: Abdul Halim an- Najār, Egypt: Maktaba al-Khānjī, 1955.

Ignāz Goldziher, Muslim Studies, Translated from German. C. R. Barbar and S. M.Stern. George Allen and Unwin LTD. London : Ruskin House Museum Street.

Juynboll, G. H. A, Muslim Tradition, Sydney: Cambridge University Press, 1983. Khan, Alam, Takyīmu Nazariyyāti Juynboll Havla al-hadis'n Nabavī, Trabzon: Kalam Yayinevi, 2019.

Mamar b. Rāshid, al- Jāmi, ed: Habib ur Rahman al-Azāmī, Pakistan: al- Majlis al- Ilmi, 1403.

Mesut, Okumuş, "Arthur Jeffery ve Kur' an Çalışmaları Üzerine". Ankara Üniversitesi İlahiyat Fakültesi Dergisi. Cilt XLIII, (2002), Say 2 s.121-150.

Noldeke, Theodor, The History of the Qurān, ed: Friedrich Schwally, Gotthelf Bergsträßer, Otto Pretzl. Translated: Wolfgang H. Behn, Leadon– Boston: Brill, 2003.

Schacht, Joseph, "Foreign Elements in Ancient Islamic Law." Journal of Comparative Legislation and International Law, 32(3/4), (1950), 9-17.

particularly in relation to the idea that the Prophet Muhammad (SAW) served as a reformer of the religion of Prophet Abraham.

Furthermore, Orientalists have historically scrutinized the reliability of narrators instrumental in transmitting Prophetic hadiths, especially those through whom a significant number of hadiths were transmitted. Ghāmidī adopts a similar approach by casting doubt on the reliability of az-Zuhrī, a key figure in the codification of hadith during the early second century after Hijra.

Based on the instances discussed above, it is evident that Jāved Ahmad Ghāmidī does not operate independently in his scholarly endeavors. The theories he presents are not original to him but rather reflect a translation of Orientalist research into Urdu, reframed within an Islamic context using novel methodologies.

References

Abdur Rehman al-badavī, Mawsūatu'l Mustashriqīn, Beirut: Dār al-Ilam, 1993.

al- Bukhārī, Abū Abdullāh Muhammad b. Ismāil, Mukhtasr Sahīh al- Bukhārī, KSA: Maktaba al-Maārif, 2002.

al-Hākim al-Nīshāburī , Abū Abdullāh Muhammad b. Abdullāh, Marifat ulūm al-Hadith, ed: Muazzam Hussain, Beirut: Dār al-Kutub al-Ilmia, 1977.

al-Khatib al-Baghdādī, Abū Bakr Ahmad b. `Ali, al-Kifāya fi ilmi'r-Rivāya, ed: Abū Abdillāh al-Suraqī, KSA: al- Maktaba al Ilmia.

al-Rāmhurmuzī, Abū Mu□ammad al-□asan b. □Abd al-Ra□mān, al-Muhadith al-Fāsil, ed: Dr. Muhammad Ajaj al-Khatib, Beirut: Dār al-Fikar, 1404.

Ammar Baksh, "Javed Ahmad Ghāmidī: A Brief

who has followed similar pathways in his study of Islam. However, it is noteworthy that Ghāmidī does not acknowledge the contributions of European scholarship in his works, which can leave his readers perplexed about the origins of his ideas.

This study has demonstrated that the foundational theories presented by Jāved Ahmad Ghāmidī are deeply rooted in Orientalist thought. He often articulates these theories, reframing them within an Islamic context by altering their methods and wording, as evidenced in his discussion of the sources of religion. For instance, he identifies the early scriptures as the foundational sources of Islam but overlooks Goldziher's detailed research asserting that Christianity and Judaism significantly influenced Islamic teachings.

Similarly, Ghāmidī raises questions about the authenticity of the variant readings of the Qurān, bolstering his arguments with classical sources, yet these ideas trace back to early Orientalists such as Théodor Noldeke, Ignāz Goldziher, and Arthur Jeffery. These scholars were among the first to introduce and develop a skeptical approach regarding the authenticity of these readings, yet Ghāmidī does not reference their work on these subjects.

The study further indicates that Ghāmidī was not the first to categorize Prophetic hadiths into Sunna and Hadith. Goldziher pioneered this classification, questioning the authenticity of both terms and rejecting the notion that Sunna can be attributed to the Prophet Muhammad (SAW). Following this, Joseph Schacht concluded that Imām Shāfī was the first Muslim theologian to attribute the Sunna to the Prophet. Ghāmidī's division of hadith and his definitions of Sunna align closely with those of Goldziher, suggesting that he rephrased Goldziher’s concepts with minor modifications,

trustworthy narrator.[24] Many early authorities in hadith scholarship regarded az-Zuhrī as credible, yet Ghāmidī aligned his critique with the approaches of Goldziher and G.H.A. Juynboll, who both questioned az-Zuhrī's reliability.

In his analysis, Ghāmidī labeled az-Zuhrī as a Mudallis, a term used in hadith sciences to describe a narrator who engages in Tadlis—a practice where the narrator conceals the identity of a source or misrepresents the chain of transmission to enhance credibility. Ghāmidī's comments particularly focused on the isnad (chain of transmission) of a well-known hadith concerning the variant readings of the Qurān, which was transmitted through the channel of Ibn Shihāb az-Zuhrī.

He further asserted that az-Zuhrī had committed both Tadlis and Idrāj in his narration. Idrāj refers to the insertion of one's own words into the text of the hadith, which can distort its original meaning. This critical stance emphasizes Ghāmidī's alignment with the skeptical views of earlier Orientalists, undermining az-Zuhrī's authority in the transmission of hadith and thereby questioning the reliability of the narratives attributed to him.[25]

Conclusion

Indisputably, the concept of Orientalism underwent a transformation in the 19th century, characterized by a concentrated focus of Orientalists on the primary sources of Islam. Their aim in studying the Qurān and Sunna was to recodify Islamic history through a developing methodology. However, as they delved into these primary sources, they shifted their focus from historical narratives to source criticism, resulting in numerous studies that have profoundly impacted both Muslim and Oriental scholars.

Jāved Ahmad Ghāmidī is a prominent Muslim scholar

G.H.A. Juynboll (d. 1431/2010)[23] adopted a similar methodology and expanded upon Goldziher's critique of az-Zuhrī in his scholarly works. Juynboll sought to complicate the narratives surrounding az-Zuhrī's historical existence and significance within the Islamic tradition. He claimed to have identified over one hundred twenty narrators named az-Zuhrī in various biographical sources, suggesting that the name had been fabricated or applied to multiple individuals over time. This assertion raised questions about the authenticity of the reports attributed to az-Zuhrī and the reliability of the transmission chain.

Juynboll specifically cited Imām Mālik (d. 179/795) as a key figure who recognized the confusion surrounding the name az-Zuhrī. He noted that Mālik preferred to refer to him as Ibn Shihāb in his narrations, in contrast to other Muhaddithūn (hadith scholars) who commonly identified him as az-Zuhrī. This preference, according to Juynboll, indicated a deliberate attempt by Mālik to avoid ambiguity and to clarify the identity of the narrator in question.

Juynboll's analysis not only aligned with Goldziher's skepticism but also contributed to an ongoing debate among Muslim and Oriental scholars regarding the historical authenticity of key narrators in the hadith tradition. By emphasizing the potential for confusion and misattribution within the narrators' lineage, Juynboll highlighted the complexities of hadith transmission and the challenges faced by scholars seeking to ascertain the credibility of early Islamic teachings.

Jāved Ahmad Ghāmidī also scrutinized az-Zuhrī in his studies, although he notably refrained from citing key sources within the science of hadith that affirm az-Zuhrī's status as a

distinguished authentic hadith from fabricated narrations.

In contrast, the Oriental School of Thought critically examined the Isnad system and scrutinized prominent narrators involved in the transmission of hadith, such as Abū Hurayrah, Nāfi, and az-Zuhrī.

Imām az-Zuhrī is a notable figure in this context, recognized as one of the first to formally codify Prophetic hadith during the reign of Umar b. Abdul Aziz. It is widely acknowledged that a substantial number of hadith reached later scholars through az-Zuhrī's channels, and he played a pivotal role in emphasizing the importance of the Isnad system during his time.

Ignāz Goldziher, aware of az-Zuhrī's influence and contributions to hadith transmission, specifically targeted him in his work, Muslim Studies. Goldziher argued that az-Zuhrī maintained close ties with the Umayyad caliphs and posited that he justified politically motivated reforms of religious life by fabricating hadith. He bolstered his thesis by referencing classical sources that reported az-Zuhrī's admissions of pressure from the Umayyad rulers to document hadith in their favor. Consequently, Goldziher labeled az-Zuhrī a "fabricator of hadith," suggesting that his narrations were compromised by political allegiance.

Goldziher's critique of az-Zuhrī reflects a broader skepticism toward the authenticity of hadith as a whole, positioning political motives as a potential source of distortion in Islamic teachings. This perspective has influenced subsequent scholarship, raising questions about the reliability of key narrators in the transmission of hadith and challenging traditional understandings of their roles within Islamic history. [22]

framework, aligning closely with Goldziher's division of Prophetic hadiths and their definitions.

Ghāmidī agrees with Goldziher regarding the role of the Prophet Muhammad (SAW), viewing him as primarily a reformer. He defines Sunna as rooted in the traditions of Prophet Abrāhīm, positing that Muhammad (SAW) continued to convey and expand this religious heritage to his followers through reformation, modification, and augmentation. This perspective mirrors Goldziher's portrayal of Muhammad (SAW) as a reformer of Abrāhīm's faith.

The principal distinction between Ghāmidī and Goldziher lies in their use of language and the arrangement of their arguments. While both scholars share a similar conceptual foundation, Ghāmidī articulates his ideas with slight modifications to Goldziher's terminology, effectively recontextualizing the theories within a contemporary Islamic discourse.

This nuanced appropriation of Goldziher's framework illustrates Ghāmidī's intellectual engagement with Orientalist thought, reflecting a blend of traditional Islamic scholarship with modern critical analysis. By doing so, Ghāmidī not only aligns himself with established Orientalist perspectives but also reasserts the significance of Sunna within the broader narrative of Islamic theology and law.[21]

4. Criticism of the Key Narrators of Hadith

The Isnad system is a defining characteristic of the Muslim community, serving as a crucial mechanism for preserving Islamic heritage. Islamic scholarship has devoted significant attention to the study of Isnad in the codification and transcription of Prophetic hadiths. Through meticulous research of the Sanad (chain of narration), scholars effectively

Sunna, characterizing it as a concept encompassing precedents and ways of life rather than a direct reference to the Prophet's teachings.

To support his argument, Schācht drew upon Goldziher's research, highlighting that the term "Sunna" had its roots in pagan practices, which were later appropriated and adapted within the Islamic framework. This assertion underscores the complexities of how terminology and concepts evolved within the socio-religious landscape of early Islam.

Furthermore, Schācht posited that Imām Shāfī (d. 204/819) was the first Muslim theologian to explicitly associate the term Sunna with the Prophet Muhammad (SAW). This development, according to Schācht, marked a significant shift in the understanding of Sunna as a formalized source of Islamic law and practice, thereby contributing to the establishment of a distinct theological identity for Islam.

Schācht's analysis invites further reflection on the historical and intellectual processes that shaped Islamic jurisprudence, emphasizing the interplay between earlier traditions and the emerging Islamic theological framework. His work, alongside that of Goldziher, has influenced subsequent scholarship on the nature of hadith and Sunna, prompting ongoing debates regarding their definitions and implications within Islamic discourse.[20]

Jāved Ahmad Ghāmidī developed a theory parallel to that of Ignāz Goldziher, categorizing the Prophetic hadiths into Hadith and Sunna. He designated Sunna as a source of religion, emphasizing its significance in Islamic jurisprudence and practice. A thorough comparative analysis of Ghāmidī and Goldziher’s theories reveals that Ghāmidī has adeptly incorporated Goldziher's research into a new conceptual

understanding of the prophetic status of Muhammad (SAW). In his study on the creed and Sharia of Islam, he presents Muhammad (SAW) not merely as a prophet but as a significant reformer within the Arab peninsula. Goldziher posits that the Prophet aimed to restore and reform the religion of Prophet Abrāhīm, which he argues had deviated from its original, pristine form over the centuries.

Goldziher asserts that the teachings and provisions brought forth by Muhammad (SAW) were not entirely new; instead, they were rooted in the earlier monotheistic tradition of Abrāhīm. He contends that the ethical and religious guidelines introduced by the Prophet were largely a continuation or revival of the core tenets of Abrāhīm's faith. This perspective suggests that Islam, in Goldziher's view, represents a rearticulation of long-standing religious principles rather than a radical departure or new revelation.

By framing Muhammad (SAW) as a reformer rather than a unique prophet, Goldziher's analysis aligns with his broader critique of Islamic texts and traditions. His arguments invite scrutiny of the foundations of Islamic belief and encourage a re-examination of the historical and theological contexts in which these teachings developed. This reinterpretation has had a lasting impact on both Orientalist studies and contemporary discussions about the nature of prophetic authority in Islam.[19]

Joseph Schācht adopted a similar analytical approach in his studies, particularly focusing on the Sanad (chain of narration) of hadith. While investigating the transmission and reliability of hadith, he affirmed Goldziher’s conclusion that the term Sunna did not originally refer to the Prophet Muhammad (SAW). Schācht elaborated on his theory of

tradition.

Goldziher distinguished between hadith and sunna, arguing that the former emerged in later times as a response to the religious and political conflicts that characterized the early centuries of Islam. He emphasized that hadith, as a formalized collection of traditions, developed as Muslims sought to navigate these conflicts and establish a cohesive religious identity.

In his analysis, Goldziher provided both linguistic and idiomatic interpretations of the term sunna. He critically engaged with scholars who equated hadith and sunna or regarded them as synonymous, asserting that such conflation was misguided. He argued that the term "hadith" itself did not originally refer to the sayings of the Prophet Muhammad (SAW) and was not an exclusively Islamic term; rather, it had existed during the Jāhiliyya (the pre-Islamic period) and was associated with the customs and traditions of the Arab tribes.

Furthermore, Goldziher posited that the term "sunna" continued to be used in Islamic contexts by Arab communities that had been minimally influenced by Islamic teachings. This perspective highlights the complexities surrounding the development of Islamic legal and cultural traditions, suggesting that they were not solely derived from the Prophet's teachings but were also shaped by pre-Islamic practices and the sociopolitical environment of early Muslim society.

By introducing these ideas, Goldziher significantly influenced the field of hadith studies and sparked ongoing debates regarding the authenticity and interpretation of Islamic texts.[18]

Moreover, Goldziher challenges the traditional Islamic

after Hijra.

Key scholars such as al-Rāmhurmuzī (d. 360/971), Hākim al-Nisāburī (d. 405/1014), Abū Nu□aim al-Isfahānī (d. 430/1039), and al-Khatīb al-Baghdādī (d. 463/1071) made significant contributions to the early studies in this field. They classified the Prophetic hadiths into several categories: al-Musnad (authenticated traditions), al-Mawqūf (stopped or narrated by companions), Mūtawātir (widely transmitted), and Ahād (individual reports). This classification system helped scholars assess the reliability and authenticity of various hadiths.

Importantly, these early scholars did not differentiate between Hadith and Sunna. Both terms were often used interchangeably, reflecting the understanding that hadiths not only serve as records of the Prophet's sayings but also encompass his actions and approvals, forming the basis for the broader Islamic tradition.

By establishing such classifications, scholars laid the groundwork for future generations to engage with the hadith literature critically, ensuring the integrity and authenticity of the teachings attributed to the Prophet Muhammad (SAW).[17]

It is a well-known fact that when Orientalists expanded their research to encompass the second primary source of Islamic law—the hadith and its related sciences—they published a variety of studies that garnered significant attention from both Oriental and Islamic schools of thought. Ignāz Goldziher is recognized as the first Orientalist to approach hadith studies with a new methodology. His seminal work, published between 1889 and 1890, dedicated the second volume of Muslim Studies to the Prophetic hadiths, articulating his theories on this essential aspect of Islamic

of the world today. Ghāmidī dismisses the other well-known seven or ten readings recorded in classical Islamic sources as unreliable.

In his discussions, Ghāmidī references the famous hadith involving Umar b. al-Khattāb and Hishām,[15] which has been cited to justify the legitimacy of variant readings. He critiques this hadith as "nugatory and meaningless," despite its inclusion in canonical hadith collections. Moreover, he examines the text of the hadith regarding the seven readings, suggesting that it could be interpreted as referring to the seven dialects or pronunciations of the Arabs. However, he argues that this interpretation is untenable, as both narrators, Umar and Hishām, belonged to the same tribe, which would negate the possibility of significant variation among them.

Consequently, Ghāmidī arrives at a conclusion akin to that of early Orientalists: that the variant readings of the Qurān emerged later, attributing this phenomenon to the influences of non-Arab scholars. This perspective reinforces his critical stance on the established narrative of Qurānic readings in Islamic scholarship.[16]

3. The Division of Prophetic Hadiths

The Prophetic hadiths hold immense significance in Muslim scholarship, representing a vital legacy inherited from Prophet Muhammad (SAW). Consequently, Muslim scholars have devoted considerable attention to these hadiths over the centuries, employing a meticulous system of narration and transcription for their compilation. To ensure the conservation and preservation of hadith, various sciences emerged, one of which is the Principle of Hadith (U□ūl al-Hadīth). This discipline began to develop during the early stages of hadith compilation but was systematically codified in the 4th century

Noldeke with great respect. Although both scholars were contemporaries, Goldziher developed his skeptical perspective, framing his theories around the distinctive characteristics of early Arabic writing, which significantly differed from contemporary script. He argued that the variations in readings arose from the original forms of writing, where Arabic characters lacked the dots that distinguish letters today. This absence of diacritical marks contributed to ambiguities in interpretation, leading to discrepancies in recitation. As a result, Goldziher dismissed many Prophetic hadiths that support the idea of varied readings, further challenging the authenticity of the Qurān as a unified text.

Together, the works of Noldeke and Goldziher played a crucial role in shaping the discourse on the Qurān's textual integrity and its implications for Islamic scholarship.[13]

The renowned Australian Orientalist and philologist Arthur Jeffery (d. 1378/1959)[14] shares a similar perspective regarding the origins of the variations in Qurānic readings. He argued that these variations arose due to the lack of diacritical marks in the text of the Mushaf compiled under Uthmān, which led readers to recite it according to their interpretations and understanding. This consensus among Théodor Noldeke, Ignāz Goldziher, and Arthur Jeffery posits that the variations in readings emerged after the death of Prophet Muhammad (SAW).

Jāved Ahmad Ghāmidī has engaged with this topic in his own scholarly work, questioning the authenticity of the variant readings. He aligns with the Orientalist viewpoint that the Qurān was revealed in one specific reading (Qirā□at), which corresponds to the reading found in the Mushaf of Uthmān, a version that is predominantly recited in many parts

In the early 19th century, European scholarship became increasingly focused on the Qurān and its associated sciences. Scholars investigated the history of the Qurān and its readings in their research, exploring the nuances of its textual transmission. One area of particular interest was the variation of readings, which Orientalists examined extensively. Their investigations led to the development of skeptical theories regarding the Holy Qurān. They characterized the Qurān and its readings as contradictory, turbulent, and unstable, raising challenges to the prophetic claims of Muhammad (SAW) and the nature of divine revelation. Additionally, these scholars expressed doubts about the authenticity of the seven or ten canonical readings, questioning the integrity of the Qurān as a sacred text.

This critical examination not only contributed to ongoing debates about the Qurān's historical and textual integrity but also prompted further inquiry into the implications of these variations for Islamic belief and practice.

The number of Orientalists specializing in the Qurān and its sciences is considerable; however, Théodor Noldeke (d. 1348/1930)[11] is often regarded as the first to systematically document the historical background of the Holy Qurān and its readings in his comprehensive studies. Noldeke critically examined the variations of recitation (Iktilāf al-Qirā□āt) within the text, providing a comparative analysis of the manuscripts attributed to Abdullah b. Mas□ūd (d. 32/652), Ubayy b. Ka□b (d. 30/651), and Uthmān b. Affān (d. 35/655). His work laid a foundational framework for understanding the complexities surrounding the Qurān's textual history.[12]

Ignaz Goldziher followed a similar methodological approach in his own study of the Qurān, often referencing

these faiths were not merely superficial but rather deeply embedded in the formative processes of Islamic jurisprudence. Schacht's studies emphasized the syncretic nature of early Islamic legal development, illustrating how interactions with existing religious traditions informed the evolution of Islamic law and its principles.[9]

Jāved Ahmad Ghāmidī also embraced a similar theory in his scholarly works, identifying early Holy Scriptures as significant sources of religion. He aligns with the conclusions of Ignāz Goldziher and Joseph Schacht, positing that Prophet Muhammad (SAW) was a student of Christian and Jewish scholars, whom he refers to as philomaths. According to Ghāmidī, these scholars served as primary sources of information for the Prophet, and their teachings significantly influenced Islamic law, which drew upon the canons of Judaism and Christianity.

A common thread in the theories of Goldziher, Schacht, and Ghāmidī is the assertion that the Qurān, Sunna, Ijmā□ (consensus), and Qiyās (analogical reasoning) are not the sole sources of religion, a viewpoint held by the majority of Muslim scholarship. Instead, they propose a more expansive understanding of the origins of Islamic teachings, acknowledging the important contributions of earlier religious texts and traditions in shaping the foundations of Islam.[10]

2. The Different Readings of the Qurān

The science of Qurānic recitation represents a vital branch of Qurānic studies, encompassing the essential knowledge regarding the various ways in which the Qurān can be recited. This knowledge has been transmitted through a rigorous narration system, passed down from generation to generation since the time of Prophet Muhammad (SAW).

with Christian and pious Jewish scholars. He suggested that Muhammad learned from these figures, integrating their teachings and perspectives into his own message, which he subsequently conveyed to his followers. This perspective opened new avenues for understanding the interfaith dynamics of the early Islamic community and highlighted the complexities of religious transmission during that era.[6]

In essence, Goldziher argues that the sources of Prophet Muhammad's information predominantly derive from interactions with Christian and Jewish scholars. He elaborates on this theory in various related discussions concerning the origins of religion. His analysis leads him to conclude that Christianity and Judaism serve as significant sources for Islam, positing that the teachings and traditions of these two faiths greatly influenced the formation of Islamic doctrine. Goldziher refers to these Christian and pious Jewish scholars as the "teachers of the Prophet," emphasizing their literacy and extensive knowledge of both the Old and New Testaments, which were well-established in the Arabian Peninsula at that time. This perspective not only highlights the interconnectedness of the Abrahamic faiths but also illustrates the role of scholarly exchanges in shaping religious narratives and practices during the early development of Islam.[7]

The British-German Orientalist Joseph Schacht (d. 1388/1969)[8] further developed the theory regarding the origins of Islam in his scholarly works. Schacht meticulously analyzed the various stages of Islamic legislation and arrived at a conclusion similar to that of Ignāz Goldziher: that Islamic law was significantly shaped by the legal frameworks and traditions of Jewish and Christian canon, as well as by other contemporary religions. He argued that the influences from

Interestingly, Ghāmidī seldom acknowledges these influences in his works, despite the fact that many of his more controversial theories can be traced back to prominent Orientalists of the 19th century. He possesses a remarkable ability to articulate complex ideas in clear and accessible Urdu, utilizing this skill to translate works from Orientalist scholars. Ghāmidī skillfully blends these translations with concepts from the Farāhī-Islāhī school of thought, adapting them into new methodologies that reflect his unique interpretation of Islamic teachings. This blending not only showcases his intellectual versatility but also raises questions about the originality of his conclusions and the transparency of his scholarly influences.

1. The Sources of Religion

Muslim scholarship traditionally identifies the Holy Qurān, Hadith, Ijmā (consensus), and Qiyās (analogical reasoning) as the essential sources of Islamic doctrine and jurisprudence. When European scholars began to focus on Islam, they undertook a critical investigation of these primary sources, developing various theories regarding their authenticity and historical provenance.

In the 19th century, Ignāz Goldziher (d. 1339/1921)[5] emerged as the first Orientalist to systematically study the primary sources of Islam, challenging their authenticity and presenting innovative methodologies for examining Islam and its origins. Goldziher's work garnered significant attention from both modern and classical scholars, influencing the trajectory of Islamic studies. He argued that the historical narratives surrounding the primary sources often reflected distortions and biases. Furthermore, Goldziher posited that Prophet Muhammad (SAW) maintained a close relationship

adhering to the traditional classifications made by early scholars concerning the relationship between Hadith and Sunna, advocating instead for a more integrated approach that highlights the Sunna's pivotal role in shaping Islamic thought and practice.[4]

A critical examination of Jāved Ahmad Ghāmidī's definition reveals that he attributes the Sunna to the Prophet Abrāhīm, suggesting that it underwent modifications and addition by the Prophet Muhammad (SAW). Ghāmidī posits that the foundational principles of the Sunna were initially established by Abrāhīm, and subsequently refined to fit the context of Muhammad's message. In his discourse, Ghāmidī also critiques prominent narrators of Prophetic hadiths, notably az-Zuhrī (d. 124/742), who played a significant role in the transmission and codification of hadith literature. However, Ghāmidī's position on az-Zuhrī appears ambiguous; he questions the reliability of this important figure within the Muslim scholarly tradition, suggesting that there may be uncertainties regarding his trustworthiness. This critique reflects Ghāmidī's broader skepticism about the methodologies employed in hadith transmission and highlights his call for a reevaluation of the sources that shape Islamic jurisprudence.

A superficial review of Jāved Ahmad Ghāmidī's works and theories may suggest that they stem solely from his extensive research, indicating that his opinions represent a synthesis of the fundamental sources of Islam. However, a deeper examination of Ghāmidī's writings reveals that he did not rely exclusively on classical Islamic sources; rather, he significantly drew upon ideas from the Orientalist School of Thought.

Dr. Alam Khan[1]

Orientalists' Influence on the Intellectual Framework of Jāved Ahmad Ghāmidī

Introduction

Jāved Ahmad Ghāmidī[1] raises critical questions regarding the primary sources of Islam, arguing that they extend beyond the commonly recognized texts. He posits that Nature, the tradition of Prophet Abrāham, and early Holy Scriptures should also be considered foundational sources of Islamic teachings. Ghāmidī expresses reservations about the various recitations of the Holy Qurān, criticizing sources that support the theory of variant readings. He contends that the Qurān was revealed in one specific Qirā'at (reading) and views the additional seven or ten recitations as interpretations influenced by non-Arab school.[2] According to him, these variants detract from the original message and unity of the Qurān, suggesting a need for a more focused understanding of the text in its authentic form.[3]

In his scholarly pursuits, Jāved Ahmad Ghāmidī has made significant efforts to introduce new methodologies for studying the Holy Qurān and the Sunna. He emphasizes the importance of establishing foundational principles, which he refers to as rudimentary principles, for comprehending these two essential sources of Islamic teachings. Within this framework, he differentiates the second source of Islamic law, categorizing it into Hadith and Sunna. Ghāmidī asserts that while Hadith serves as a crucial component of Islamic jurisprudence, he elevates the status of the Sunna, recognizing it as a fundamental source of Islam. Notably, he refrains from

[1]Ex- Associate Professor, Gümüşhane Üniversitesi, Türkiye.